کا پورا لطف ہے، لیکن نظم کی زبان کے مقابلہ میں دیباچہ کی نثر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہے، اس کا نہ ہونا ہی بہتر تھا،

رشحات القرآن، مرتبہ مولوی ذکاء اللہ خاں صاحب ایم اے رٹائرڈ کلکٹر، نائب دیوان ریاست دتیا، پتہ: لطیفی پریس، دہلی دروازہ، دہلی،

اس رسالہ میں مرتب نے کلام اللہ سے دلائل توحید، رحمت باری، اثبات رسالت، اتباع رسول، اور اعجاز القرآن وغیرہ، سترہ مضامین کی آیات منتخب کرکے ترتیب کے ساتھ مع ترجمہ جمع کر دی ہیں، کہیں کہیں اپنے ذوق سے ان آیات سے مستنبط فوائد بھی لکھ دیے ہیں، کتاب مفید ہے،

یار غار، مؤلفہ جناب محمد ظفر صاحب ایم ایل بی، تقطیع جیبی ضخامت ۱۲۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نہایت معمولی، ۱/ر ٹکٹ بھیجکر انجمن رفیق الاسلام گوڑگاوان پنجاب سے منگایا جاسکتا ہی،

انجمن رفیق الاسلام گوڑگاوان مسلمان بچوں کی اخلاقی اور مذہبی تعلیم و تربیت کے لئے اکابر اسلام کے مختصر سوانح اور چھوٹے چھوٹے مذہبی رسالے شائع کرکے مفت تقسیم کرتی ہے، یہ مختصر رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے، اس میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات ہیں، اس رسالہ کی ظاہری شکل بہت خراب ہے، لیکن اس شکل میں بھی مفت تقسیم کرنا بڑی ہمت کا کام ہے،

سعی ناکام، مترجمہ امۃ الرفیق صاحبہ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۸/ر، پتہ: دار الترجمہ متصل سنہری ہوشیارپور پنجاب،

ڈنمارک کے مشہور افسانہ نگار ہینز اینڈرسن کے آٹھ افسانوں کا ترجمہ ہی، اس کے افسانون مین تخیل کی دلکشی کی وجہ سے کہانیوں کا لطف آتا ہی اسلئے بچوں کیلئے خصوصیت کیساتھ زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں، افسانوں کا حسن انتخاب اوران کا کامیاب ترجمہ ہونہار مترجمہ کیلئے فال نیک ہی،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۹ء | عدد ۲

مضامین

شذرات

دارالمصنفین نے اپنا جو نپڑا ایسی جگہ ڈالا ہے جہاںتک وہی پہنچ سکتے ہیں جو اخلاص میں پورے
ہیں، شرک کا یہاں موقع نہیں، اور نہ "بیک کرشمہ دو کار" کا اصول کارگر، وہ سیدھی ریلوے لائن سے
پرے، آباد اور پررونق شہروں سے دور کھیل تماشوں سے خالی، تاریخی دلچسپیوں سے محروم، اور شہری
ہنگاموں اور غل شور سے دور ہے، پھر بھی اگر کوئی یہاں پہنچ جاتا ہے تو خلوص کے سوا کوئی اور اس کا
رہبر نہیں، یہ دلی، لکھنؤ، لاہور، اور کلکتہ نہیں جہاں "بزم اغیار میں گاہے گاہے سر راہے" ملاقات کا
اتفاق ہوجائے، پھر بھی ایسے مخلصوں سے کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا،

———

کچھ دن ہوے کہ روس کے مشہور مصلح عالم موسیٰ جار اللہ یہاں تشریف لائے تھے، میں نہ تھا،
میری ان کی ملاقات ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ میں ہوئی تھی، اس کے بعد وہ کئی دفعہ ہندوستان آچکے، مگر
ملنے کی نوبت نہیں آئی، اس کا سبب بھی وہی اعظم گڈہ کا سیدھی ریلوے لائن سے دور ہونا ہے، مگر
بہرحال انھوں نے خود زحمت اٹھائی، اور تشریف فرما ہوے، ہمارے رفقا نے ان کی ملاقات اور
صحبت سے فیض اٹھایا،

———

اس مہینہ ہمارے کابل کے دوست سرور خان گویا نے اپنی ملاقات کی مسرت بخشی، یہ کابل کے مشہور بزرگ
عبدالقدوس خاں کے نواسہ ہیں اور خود بھی ممتاز ادیب اور شاعر ہیں، عربی اور انگریزی سے واقف اور
فارسی ادبیات کے ماہر ہیں، انجمن ادبی کابل کے ممبر اور وہاں کی نوجوان ادبی تحریکات کی روح رواں ہیں

دو برس ہوے کہ فردوسی کی ہزار سالہ برسی کے موقع پر افغانستان کے نمایندہ ہوکر یہ اور ہز اکسلنسی صلاح الدین
سلجوقی سفیر دہلی ایران گئے تھے، اور شاہ پہلوی سے ملے تھے، آجکل یہ کمل تاریخ آل سبکتگین بیہقی کی تصحیح
اور اس کے نسخوں کی تلاش میں ہیں، اسکا ایک حصہ مدت ہوئی کہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی طرف سے
شائع ہوچکا ہے، مگر پوری کتاب اب تک نہیں چھپی ہے، بلکہ ملتی بھی نہیں، سرور خاں نے اس کا معتد بہ
حصہ پیدا کرلیا ہے، مگر ابھی تک اس کے ایک کمل نسخہ کی تلاش جاری ہے،

وہ پشاور اور لاہور ہوکر دہلی آئے، دہلی سے علیگڈہ گئے اور مسلم یونیورسٹی کے کتبخانہ کی سیر کی،
یہاں سے حبیب گنج جاکر حبیب گنج کے خزانہ کو پرتالا، وہاں سے رامپور جاکر ریاست کے سرکاری
کتبخانہ کو دیکھا، پھر لکھنؤ پہنچ کر دو دن مولوی سید ہاشم صاحب ندوی معتمد دائرۃ المعارف حیدرآباد
کے ساتھ ندوہ میں قیام کیا، اور وہاں کے کتبخانہ کی دیکھ بھال کی، اس کے بعد وہ دارالمصنفین اعظم گڈہ
آئے اور یہاں تین روز ٹھہرے، یہاں سے بنارس ہوکر پٹنہ گئے، اور وہاں کے مشہور علم دوست رئیس
مولوی ریاض حسن خاں خیال کے مہمان ہوے اور خدابخش خان کے مشہور کتبخانہ کو دیکھا، پٹنہ سے وہ کلکتہ ہوکر
شانتی نکیتان پہنچے ہیں، وہاں سے وہ حیدرآباد جائینگے، امید ہے کہ حیدرآباد کے علم دوست اس عزیز مہمان
کا شاندار خیر مقدم کرینگے،

———

دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے امسال چند نہایت اہم کتابیں شائع کی ہیں، جنمیں سے ایک اصول
روایت میں خطیب بغدادی کی کتاب الکفایہ ہے، اور دوسری فلسفہ میں ابوالبرکات بغدادی کی کتاب
المعتبر کی پہلی جلد تیسری ابن جوزی کی صفۃ الصفوۃ کی چوتھی جلد علماے صوفیہ کے حالات میں، چوتھی
حدیث میں سنن کبریٰ بیہقی کی نویں جلد، اور پانچویں ابن ہیثم کے آٹھ رسالوں کا مجموعہ (علم نور و مناظر میں)
یہ سب کتابیں اسلامی علوم و فنون کی تاریخ میں نہایت اہم اور اساسی تصنیفات ہیں، دائرہ نے ان کو
چھاپ کر اپنے نئے کارناموں کی بہترین مثال پیش کی ہے،

———

حیدرآباد دکن کی ریاست کے خلاف آریہ سماج نے جو شور وغل برپا کر رکھا ہے وہ اس درجہ بے معنی ہے کہ خود ہندو اصحاب اسکی بے مائگی کا جابجا اظہار کر رہے ہین، یہ کیسی عجیب بات ہے کہ خود حیدرآباد کی ہندو رعایا خاموش ہے اور پنجاب دہلی، شولاپور اور پونا کے آریہ شورش کر رہے ہیں، اور بات اتنی ہے کہ ریاست نے باہر کے مقرروں کی بے اجازت تقریروں کو روک دیا ہے، جسمیں ہندو مسلمان سب داخل ہیں، یہانتک کہ میں بھی جب دو برس ہوئے حیدرآباد گیا تھا، تو حیدرآباد میں کوئی مذہبی تقریر اجازت کے بغیر نہ کر سکا، اور اسی لیے سکندرآباد میں جاکر تقریر کیجاسکی، ریاست کا مقصود یہ ہے کہ باہر کے مقرر آکر ریاست کی صلح و آشتی اور امن و امان کی فضا کو مکدر نہ کریں،

آریہ سماجیوں کی تقریرین جتنی غیر ذمہ دارانہ اور فتنہ انگیز ہوتی ہین، وہ ہندوستان بھر مین ان کے اپدیشکوں کی تقریروں سے ظاہر ہے، مسلمانوں، عیسائیون اور سناتن دھرمیونکے بزرگوں کی نسبت ان کے ناشایستہ کلمات ایسے ہوتے ہین جنکی ایک چنگاری سارے ملک کو جلاکر خاک کر سکتی ہے، اور اسکی بارہا مثالین ملک میں دیکھی جاچکی ہیں، اس لئے ہر حکومت کا فرض ہے کہ وہ ایسی فتنہ انگیزیون کو جہانتک ہوسکے اپنے ملک میں روکے،

حیدرآباد ہندوستان کا وہ خطہ تھا جو ہندو مسلم اتحاد کا مجسمہ تھا، افسوس ہے کہ پنجاب، دلّی اور مہاراشٹر کے مقررون نے جاجاکر اس "مورتی کھنڈن" میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھی، اور اگر وہ ابتک ٹوٹ نہیں سکا ہے، تو یہ اس کی غیر معمولی مضبوطی اور استحکام کا نتیجہ ہے،

حیدرآباد کی بے تعصبی اور رواداری کی اگر کوئی مثال دیکھنی ہو تو وہاں کے مندروں، مذہبی ہندو اوقاف اور جاگیروں کو جاکر دیکھیے، خصوصًا اس زمانہ میں اسکی مثال حیدرآباد کے سوا اور کہاں ملسکتی ہے کہ محکمۂ امور مذہبی میں ہندو مددگار امور مذہبی کا تقرر خاص ہندو معابد اور مندرون کی دیکھ بھال کیلئے الگ ہے، اس پر یہ بات بھی جاننے کے قابل ہے کہ حیدرآباد ہندوؤں کا نہیں، اچھوتوں کا دیس ہے، جس کو آریہ ہندوؤن سے کوئی تاریخی تعلق نہیں ہے،

مقالات

قرآن پاک کا تاریخی اعجاز

دنیا کے ہر پیغمبر نے اپنی امت کے سامنے حیرت انگیز معجزے پیش کئے ہیں حضرت نوحؑ کی دعا نے عالم کو غرقاب کر دیا، حضرت شعیبؑ اور لوطؑ کی دعاؤں نے آتش فشاں پہاڑوں کے دہانوں سے آگ برسائی، حضرت موسیٰؑ کے معجزہ نے فرعون کو بحر احمر کا طعمہ بنایا، عصائے موسیٰ کی کار فرمائی نے چٹانوں کی چھاتی سے پانی کا دودھ بہایا، اور بحر احمر کے دو ٹکڑے کر دیئے، دم عیسیٰؑ نے جنم کے اندھون کو بینا، اور کوڑھیوں کو چنگا کیا، فرش موت کے سونے والون کو جگایا، اور قبر کے مردوں کو باذن اللہ کہہ کر جلایا،

یہ واقعات دنیا میں پیش آئے، اور ختم ہوگئے، برق کا شرارہ تھا، جو دم کے دم میں چمکا، اور بجھ گیا، لیکن ایک پیغمبر ایسا بھی آیا جس کے حیرت انگیز معجزہ نے قوموں کو ہلاک کرنے کے بجائے ان کو حیات تازہ بخشی، پتھر دلون کو موم عقل کے اندھوں کو بینا اور بنی آدم کی پوری جمعیت کو غفلت و بیہوشی کی نیند سے جگاکر ہشیار اور کفر و شرک کی ہلاکت سے بچاکر زندہ کیا، یہ حیرت انگیز واقعہ بجلی کی چمک کی طرح دفعتًہ ظاہر ہو کر غائب نہیں ہوگیا، یہ ید بیضا، عصائے موسیٰ، اور دم عیسیٰ کی طرح اپنے امکان اور وقوع میں فلسفیانہ موشگافیوں اور عقلی نکتہ سنجیون کا محتاج نہیں، یہ روز روشن کی طرح واقعہ کی صورت میں ظاہر ہوا، اور ہزار سال تک ممتد و متواتر واقعیت بنکر دنیا، اور اہل دنیا کے سامنے جلوہ گر رہا،

محمد رسول اللہ صلعم آخری دین، اور آخری صحیفہ لیکر اور نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ بنکر اس دنیا میں تشریف لائے، آپ کے بعد نہ کوئی نیا دین آنے والا، نہ کوئی نئی کتاب اترنے والی، اور نہ کوئی نئی نبوت مبعوث ہونے والی تھی، اسلئے ضرورت تھی، کہ دوسرے انبیاء علیہم السلام کی طرح آپ کا خاص معجزہ وقتی اور عارضی نہ ہو، بلکہ جب تک اس دنیا میں آپ کی نبوت کا نور چمکتا ہے، اس کی روشنی بھی قائم رہے، چنانچہ وقتی اور عارضی معجزوں کے علاوہ آپ کو ایک ایسا خاص معجزہ بخشا گیا، جو قیام قیامت تک قائم اور باقی رہنے والا ہے، قرآن نے تحدی کی کہ میں اپنے رسول و پیغمبر کی صداقت کی گواہی ہوں جن وانس مل کر بھی چاہیں، تو مجھ جیسی کتاب، بلکہ مجھ جیسی کتاب کی ایک سورہ، بلکہ ایک آیت بھی بنا کر پیش نہیں کر سکتے، اس اعلان پر پوری چودہ صدیاں گذر چکی ہیں، مگر اب تک فضائے بسیط کے ہر گوشہ میں اسکے جواب میں خاموشی چھائی ہے،

یہاں بھی عقل و فلسفہ کی منطقیانہ نکتہ آرائیوں سے بچ کر آیئے تاریخ کے آئینہ میں واقعیت کا چہرہ دیکھیں، قرآن پاک دنیا کی سب سے تاریک سرزمین میں سب سے جاہل قوم پر اترا، جو علم و تمدن سے عاری دولت و ثروت سے خالی، سامان و اسلحہ سے محروم، اور ہر قسم کی دنیاوی اور مادی طاقت سے تہی مایہ تھی، قرآن نے تیرہ برس تک کبھی پہاڑوں کے غاروں سے اور کبھی پہاڑوں کی چٹانوں سے انسانیت کو آواز دی، اس طویل مدت میں اسکی پکار کے جواب میں، سب و شتم، سنگریزے اور پتھر، تیر تبر اور تیغ و خنجر کی بارش ہوتی رہی، لیکن جونہی کہ چودھویں برس کا چاند طلوع ہوا، اسکی روشنی ماہ شب چہاردہم بن کر نمودار ہوئی، اور چند سال کے عرصہ میں دیکھا تو عرب کا گوشہ گوشہ بقعۂ نور بن گیا،

قرآن کا سب سے بڑا تاریخی معجزہ یہ ہے، کہ ۲۳ برس کی تعلیم میں ایک ان پڑھ اور جاہل قوم کو دنیا کی عالم ترین اور متمدن ترین قوم بنا دیا جس کی عظمت نے دنیائے قدیم کے دونوں بازو قیصر و کسریٰ کو توڑ دیا، چالیس برس کی مدت میں جب خلافت راشدہ کا دور ختم ہوا، قرآن کے ماننے والوں

نے جو بحر ہند کے دہانہ سے لیکر بحر اٹلانٹک کے ساحل تک پھیلے ہوئے تھے، دنیا کی کایا پلٹ دی، تاریکی کی جگہ نور، جہالت کے بدلہ علم، شرک و کفر کے بجائے خدا پرستی آئی، دنیا کی سب سے غریب و مفلس قوم سب سے بڑی دولتمند، اور سب سے نادان و جاہل و وحشی قوم سب سے بڑی عالم و علم پرور اور متمدن ہو گئی، دنیا کی سب سے ضعیف و کمزور قوم سب سے قوی اور سب پر غالب ہو گئی، وہ قوم جس کو دنیا میں کبھی سیاسی عزت وجاہ و جلال نصیب نہیں ہوا تھا، اس نے دنیا کی شہنشاہی کا تاج اپنے سر پر رکھا،

عرب و عجم، ترک و دیلم، حبش و زنگ، ہند و سندھ جس نے بھی قرآن کو اپنے سینہ سے لگایا، اس نے فتح و ظفر کا پرچم ہاتھ میں لیا، تخت شاہی اپنے دونوں پاؤں کے نیچے بچھایا، اور حکومت کا تاج اپنے فرق شاہی پر رکھا، عربوں کی کیا بساط تھی، دیلم کو کون جانتا تھا، سلجوق سے کون واقف تھا، غور و خلج و تغلق کس شمار میں تھے، کرد کس گنتی میں تھے، خوارزمشاہی، اتابکی اور مصر کے بحری ممالیک اور ہندوستان کے ترکی غلاموں کی حیثیت کیا تھی، اور مٹھی بھر آوارہ گرد ترک قبیلہ کا سردار عثمان خان جسکی اولاد نے، یورپ ایشیا اور افریقہ دنیا کے تین براعظموں پر چھ سو برس تک حکومت کی، اسلام سے پہلے کیا تھا، مگر جب انھوں نے اپنی عقیدت کا سر قرآن کے آگے جھکایا، تو دنیا کی شہنشاہیوں نے ان کے آگے اپنی گردنیں جھکا دیں،

بربروں کا تمدن کیا تھا، افریقہ کے وحشیوں کا رتبہ کیا تھا، بربر کی بربریت کی داستانوں سے کون آگاہ نہ تھا، ترک و تاتار کی درندگی کے واقعات سے کس کے کان آشنا نہ تھے، مگر دیکھو کہ جب قرآن نے اُن کے سر پر سایہ ڈالا، تو انہی کے ہاتھوں سے عظیم الشان سلطنتوں کی بنیادیں پڑیں، بڑے بڑے متمدن شہر آباد ہوئے، علوم و فنون کی درسگاہیں کھلیں، اور تمدن و تہذیب کے نقش و نگار اور آثار نمودار ہونے لگے، فلسفہ و عقل کی جلوہ آرائی ہوئی، علم و فن نے ترقی کی بیسیوں نئے علوم اختراع ہوئے، پچھلے علوم نے رونق تازہ پائی، اور ان کی بری اور بحری تجارتوں نے دنیا کی منڈیوں پر قبضہ کر لیا

ان سب ماورا، اور مادہ و مادیات سے ہٹ کر انسانی اخلاق و آداب نے اسی قرآن کی تعلیم وہدایت سے تکمیل کا درجہ پایا، عدل و انصاف اور اخوت و مساوات کے سبق ابھر ہوئے، اور اہل جہان کی آنکھوں کو وہ منظر دکھا دیا، جس کو آغاز آفرینش سے آج تک انھوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا، مغرب کی قوموں کو مشرق سے اور مشرق کی بستیوں کو مغرب سے ملا دیا، اور حسب و نسب، قومیت و وطن، پستی و بلندی، اور شاہی و گدائی کے ہر قسم کے نشیب و فراز کو مٹا کر قرآن والوں کی ایک برادری اور واحد قومیت پیدا کر دی جس کا وطن دنیا کا ہر ملک اور جس کا مسکن دنیا کا ہر گوشہ تھا،

باطل پرستی کے ہر طلسم کو توڑ دیا، بتوں کے ہیکل مسمار کر دیئے، ستارہ پرستی کا چراغ گل کر دیا، انسانی جانوں کی قربانی موقوف کر دی، دختر کشی کی رسم کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیا، عورتوں کو عزت، غلاموں کو آزادی، اور غریبوں کو بشارت دی، اور سب کیلئے صرف ایک ایمان اور عمل صالح کو ہر قسم کی ترقیوں اور سعادتوں کا زینہ بنایا، اور بتایا کہ انسانی سعادت کی شاہراہ غاروں، خلوتوں اور پہاڑوں سے ہو کر نہیں گذری ہے، بلکہ شہروں، بازاروں مجمعوں اور انسانی بھیڑ بھاڑ کے اندر سے گذری ہے، حق کی نصرت انسانوں کی بھلائی، یتیموں کی سرپرستی، غریبوں کی امداد، گرتوں کی دستگیری، مظلوموں کی فریاد رسی اور غلاموں کی آزادی ہی نیکیوں کی جڑیں ہیں، اور اس راہ میں ہر قسم کی جد و جہد زحمت کشی و محنت اور ایثار و قربانی، اصلی نفس کشی و ریاضت ہے،

اور سب کے آخر میں اور سب سے بڑھکر اس نے مسلمانوں کو اللہ کے ایک آستانۂ قدس کے سوا دنیا کی قوت کے ہر آستانہ سے بے نیاز کر دیا، خدائے قادر کی قدرت کے سوا ہر قدرت سے وہ بے نیاز، اور ہر قوت سے وہ بے پروا ہو گئے، انھوں نے فرعونوں کو دریا میں ڈھکیل دیا، نمرودوں کے تخت الٹ دیئے، ہامانوں کی سلطنتیں چھین لیں، اور شدادیوں کی بہشت پر قبضہ کر لیا، اور یہ سب کچھ اسلئے وہ کر سکے، کہ انھوں نے ان سب جھمیلوں کے ساتھ ہر رشتہ محبت کو توڑ کر صرف خدا سے

اپنا رشتہ جوڑا تھا، ان کے ہر عمل کی غایت اللہ کی خوشنودی، اور رضامندی تھی، تو اللہ بھی ان سے خوش ہوا، اور اپنی خوشنودی کا ہر خزانہ ان کے لئے کھول دیا،

قرآن نے اللہ والوں کی جماعت پیدا کی، جو اللہ ہی کے لئے کرتی اور چھوڑتی تھی، اللہ ہی کیلئے دیتی اور لیتی تھی، اور اسی کے لئے جیتی اور مرتی تھی،

مسلمانو! ربانی قوت کا یہ سرمایہ اب بھی تمھارے پاس ہے، اور اللہ کے اس خزانۂ رحمت کی کنجی اب بھی تمھارے ہاتھوں میں ہے، ہمت کرو، اور ادب سے اس کے اوراق کو کھولو، اس کے معنوں کو سمجھو، اسکی باتوں پر یقین کرو، اور اس کے حکموں کو مانو اور عمل کرو، پھر دیکھو کہ تم کہاں سے کہاں پہونچتے ہو، والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ،

ارمغانِ احباب

یعنے

دلی اور اسکے اطراف

آج سے پینتالیس برس پہلے،

از مولینا سید عبدالحئی صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء

(۲)

چاندنی چوک روز شنبہ ۲۱ رجب، حوائجِ ضروری سے فراغت کر کے درسگاہ گیا، مقدمہ صحیح مسلم اور بخاری شریف کا سبق سن کر قیام گاہ پر واپس آیا، آج دن بھر طبیعت منغض رہی چار بجے تک کہیں جانیکا اتفاق نہیں ہوا چار بجے کے بعد چاندنی چوک تفریحاً خراماں خراماں گیا، کہ کچھ طبیعت بہلے،

یہ چوک نہایت ہی خوبصورت ہے، اس میں تین سڑکیں ہیں، دورویہ مکانات اور دوکانوں کی قطار قابلِ دید ہے، بیچ کی سڑک کسی قدر بلند ہے، نہر پاٹ کر بنالی گئی ہے، اسی وجہ سے نہر بند ہے، اس کے اندر پانی ہر وقت جاری رہتا ہے، دورویہ اس سڑک کے درخت سایہ دار ہیں، اس پر لوگ پیادہ پا چلتے ہیں اس کے دائیں اور بائیں جانب کی سڑکوں پر گھوڑے بگھی کی آمد و رفت رہتی ہے، بیچ چوک میں گھنٹہ گھر ہے، گھنٹہ گھر کے سامنے ملکہ کے باغ کا دروازہ ہے، اس میں گھستے ہی ایک بہت بڑی عمارت ملتی ہے، اس میں عجائب خانہ ہے، مین نے ابھی عجائب خانہ کی سیر نہیں کی، یہ باغ اسٹیشن تک برابر چلا گیا ہے، وہاں سے آکر قیام گاہ پر رہا کہیں نہیں گیا، کیونکہ بھائی جی تنہا تھے،

پھر خانقاہ بروز یکشنبہ ۲۲ رجب، آج صبح کو اٹھکر نماز و تلاوت و حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ گیا، کسی وجہ سے آج سبق نہیں ہوئے، مولوی صاحب ممدوح کو کچھ ضرورت تھی، ترجمہ کے

بعد گھر چلے گئے، میں وہان سے سیدھا خانقاہ شریف گیا، وہ ولایتی خادم اس وقت نہ تھا، وہان سے آگے بڑھ کر شاہ ترکمان کے قبرستان گیا، یہین خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کا مزار ہے، ایک مسجد بنی ہوئی ہے، اس کے سامنے ایک دالان ہے، دالان کے اندر ہو کر دوسرا کھلا ہوا درجہ ملتا ہے، اس میں مزار ہے، مین نے فاتحہ پڑھا، اس کے بعد ان کے والد ماجد خواجہ محمد ناصر عندلیب کی قبر پر فاتحہ پڑھا، یہان سے نکل کر اور بزرگوں کے مزارات ہیں، ان پر فاتحہ پڑھتا ہوا پھر خانقاہ شریف واپس آیا، اس وقت وہ ولایتی خادم موجود تھے، ان سے معلوم ہوا، کہ اب تک خطوط نکالنے کا حکم نہیں آیا، آج میں اجازت حاصل کر کے نکالوں گا، پھر جیسا جواب ملیگا، کل یا پرسوں جب آؤ گے، تو تم سے کہدوں گا، وہاں سے میں واپس آیا، وہان سے قریب ہی ایک مسجد ہے، اس میں ایک بنگالی مولوی صاحب رہتے ہیں، انھون نے کہا مولینا صاحب کسی سے نہیں ملتے، کابل و بخارا کے بڑے بڑے عمائد و درویش و مشائخ ملنے آیا کرتے ہیں، مگر ناکام واپس جاتے ہیں،

مولینا عبدالحق حقانی پھر میں قیام گاہ واپس آیا، ظہر کی نماز پڑھکر مولوی عبدالحق صاحب مصنف تفسیر حقانی سے ملنے کے لئے محلہ بلی ماران گیا، مولوی صاحب ممدوح حکیم عبدالمجید خان کے مکان کے آگے مطبع فاروقی کے سامنے رہتے ہیں، وہاں جانے پر معلوم ہوا کہ مولوی صاحب نہیں ہیں، کسی سے ملنے گئے ہیں، تھوڑی دیر بیٹھکر وہان سے مولوی فضل اللہ کے پاس گیا، ڈپٹی ہادی حسین خان کے مکان کے سامنے متصل مدرسہ طبیہ کے ایک کمرہ پر بکرایہ رہتے ہیں، وہ ملے ان کے پاس مغرب تک بیٹھا رہا، وہاں سے پھر قیام گاہ پر واپس آیا،

پھر خانقاہ روز دوشنبہ ۲۳ رجب۔ آج شب ہی سے پانی برس رہا ہے، ترشح کی وجہ سے کہیں جانیکا موقع نہیں ہے، سڑکیں بہت خراب ہو رہی ہیں، دس بجے ترشح موقوف ہوا، اس وقت میں خانقاہ کی فکر میں گیا، خانقاہ شریف کے دروازہ پہ امرائے پنجاب کھڑے ہوئے تھے، ان کو پروانگی

نہیں دی گئی، فاتحہ باہر سے پڑھکر واپس گئے، میں محمد علیخان ولایتی خادم کے انتظار میں ٹھہرا رہا، اس
اثنا میں ایک پیر مرد آئے مجھ سے معمولی تعارف ہوا، خانقاہ شریف کے محاذی دوسرے جانب
سڑک کے ایک نہایت عمدہ حویلی ہے، اس کے دروازہ کو کھولکر اندر گئے، تھوڑی دیر کے بعد ایک
خادم نکلا مجھ سے کہا کہ اندر بلاتے ہیں، میں اندر گیا انھوں نے نہایت عزت و توقیر کیساتھ اپنے سجادہ
کے قریب ایک رومی غالیچہ پر مجھکو بٹھایا، اس کے بعد مجھ سے پوچھا، کہ آپ کہاں سے تشریف لائے
میں نے بیان کیا، پھر پوچھا، کہ کیوں تکلیف کی، میں نے کہا، کہ بزرگوں کی زیارت اور مشائخ کرام
کے مزاروں پر فاتحہ خوانی کی غرض سے پھر انھوں نے سلسلۂ بیعت کو پوچھا، میں نے اپنے سب سلاسل
بیان کئے، ماموں صاحب[1] مرحوم مغفور کا نام سن کر انھوں نے کہا کہ وہ میرے پیر بھائی تھے، مجھ کو
ان سے ظاہری ملاقات نہیں ہے، لیکن میں ان سے خوب واقف ہوں، ان کے انتقال کے بعد ان
کے مریدوں میں کچھ جھگڑا ہو گیا تھا، وہ لوگ یہاں آئے تھے، پھر کہنے لگے، کہ آجکل زمانہ کے فتنہ انگیزی
کی وجہ سے حقانیت جاتی رہی ہے، للٰہیت کی جگہ نفسانیت نے دلوں میں گھر لیا ہے، لوگ جو
کرتے ہیں، وہ خدا کے واسطے نہیں کرتے، طلب جاہ و مفاخرت مدنظر ہوتا ہے، اصل یہ ہے کہ ہمیتر
قاصر ہیں، جب نوکری چاکری کے قابل نہ ہوے، تو اس طریقہ کو اختیار کرتے ہیں، اور فی زعمہ سمجھتے
ہیں کہ یہ طریقہ سہل ہے، حالانکہ یہ بہت دشوار گذار راستہ ہے، آج کل جہان تک دیکھا جاتا ہے ایسے
مشائخ بہت ملیں گے، جو ظاہرداری درست کئے ہیں، وظیفے وظائف کے بھی پابند ہیں، لیکن ایسے
لوگ جو ظاہرداری کیساتھ دل میں خدا کی محبت بھی رکھتے ہیں انکی صحبت سے لوگوں کو فیض بھی حاصل ہوتا ہے
باوجود تعلقات کے ان کی طبیعتیں پابند علائق نہیں ہیں، بہت کمیاب ہیں، بلکہ دیکھا سُنا نہیں جاتا

---

[1] حضرت مولینا شاہ سید عبد السلام صاحب ہسوی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ۔

اس کے بعد میں نے پوچھا کہ مولینا ابو الخیر صاحب نے خانقاہ شریف کی آمد و شد بالکل مسدود کر دی ہے
اسکی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں کہا کہ یوں تو لوگوں کے طرح طرح کے خیالات ہیں، جتنے لوگ ہیں
اتنی رائیں ہیں، لیکن ان کے دل کا حال کس کو معلوم ہے، یہ سنا جاتا ہے کہ بعض لوگوں سے انھوں نے
یہ بیان کیا کہ کوئی ملنے کے لائق نہیں ہے، بعض سے یہ بھی کہا کہ جو ملنے کے لائق ہیں وہ ہم سے ملنے آتے
نہیں، جو ملنے کے لائق نہیں ہیں، وہ آکر گھیرتے ہیں، کوئی کچھ مانگتا ہے، کوئی اپنی حاجت روائی
چاہتا ہے، خیر کوئی سبب ہو، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس سے عام ناراضگی پھیلی ہوئی ہے، تمام شہر
برا کہتا ہے، وہ کسی کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے، لوگ دور دور سے فاتحہ کو آتے تھے، وہ بند ہے، نماز
کو مسجد میں جاتے تھے، وہ بند ہے، کتنے حسرت کی بات ہے، کہ ان کے آنے سے امید تھی، کہ خانقاہ
آباد ہو گی، اب پہلے سے زیادہ ویران ہے، مسجد میں اذان تک نہیں ہوتی، میں نے کہا کہ اذان کب سے
موقوف ہوئی، اور کیوں موقوف ہے، کہنے لگے، دو برس سے تو پھاٹک بند ہے، لیکن اذان مسجد
میں ہوتی تھی، اس پر کسی طالب العلم نے لکھ کر لیٹر بکس میں ڈال دیا، کہ جب نماز کو کوئی آنے نہیں پاتا تو
بلایا کیون جاتا ہے، اس وقت سے جس کو آٹھ مہینہ کا عرصہ ہوا، اذان بھی بند کر دی، میں نے کہا کہ
جمعہ و اعیاد کی نمازین جماعت کیساتھ مشروط ہین، وہ کیونکر ادا ہوتی ہیں، کہنے لگے، شاید وہ کہتے
ہیں، کہ جماعت مسلمانوں کی اور آدمیون کی ہوتی ہے، جب کوئی آدمی ہی نہیں تو کس کے ساتھ جماعت
کیجائے کہنے لگے صاحبزادہ ہیں سمجھتے نہیں، نماز وغیرہ بند نہیں ہو سکتیں، لیکن ان کے ساتھ کسی نے اب
تک شر نہیں کیا، ورنہ کس کی مجال ہے، کہ وہ بند کر دے، ان کو ایسے کسی سے نہیں ملنا ہو تو گھر کے
دروازے بند کر لین، مسجد سے کیا تعلق، افسوس ہے کہ وہ خانقاہ جہاں کثرت و ہجوم طالبین سے
رہنے کی گنجائش نہ تھی، اب بالکل غیر آباد اور خالی پڑی ہے، لیکن ان کو نشیب و فراز کون سمجھائے
ایسے لوگ جو کہہ سکین اون کے یہاں جاتے نہین جو جاتے ہیں، وہ کہہ سکتے نہیں، مسجدین قریب قریب ہیان

بہت ہیں، اس وجہ سے ہم لوگ چپ ہیں، لوگوں نے تکفیر کے فتوے لکھ لکھکر بکس میں ڈال دیئے، مگران
کو کچھ تنبہ نہیں ہوتا، غربا سے تو ملتے ہی نہیں کسی کسی سے جس کو وہ کچھ سمجھتے ہیں، مل لیتے ہیں، جب بیمار ہوتے
ہیں، تو آخر حکیم کو بلاتے ہیں، اکثر خود ان کی طبیعت ناساز رہتی ہے، ان کی دو بچیاں ہیں بیوی ہیں وہ علیل
ہوتی رہتی ہیں، حکیم کو بلاتے ہیں، حکیم کو بلانے کے واسطے اور کسی شخص کو بلاتے ہیں تاہم عام طور پر نہیں ملتے
اسکی ابتدار تو چار برس سے پڑ چلی تھی، لیکن اب انتہار ہو گئی، ان بزرگ کا نام عبد الرحیم ہے، ۱۲۴۱ھ میں
دہلی آئے، جب سے یہیں رہتے ہیں، چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے میں آپ کی کیا تواضع کردن، کچھ نقل
چرونجی وانہ کشمش رکھی تھیں، وہ لاکر دیں اور کہا کہ یہ فاتحہ کے تبرک ہیں، ان کے پاس سے اٹھ کر پھر میں
باہر آیا، محمد علی خان نہ تھے، ایک مسجد وہاں سے بہت قریب ہے، وہاں جاکر لیٹا رہا، وہی تبرک کھاکر
پانی پیا، کچھ تسکین ہوئی، میرا خیال تھا کہ آج جواب ہست نیست کا مل جائے، تو روز روز کی دوا دوش
سے نجات ہو، خانقاہ شریف میرے قیام گاہ سے بہت دور ہے، وہ شہر کے اس کنارہ ہے، اور میں
شہر کے اس کنارہ اسٹیشن کے پاس ٹھہرا ہوں، ظہر کی نماز اسی مسجد میں پڑھی، اس کی تھوڑی دیر بعد
محمد علی خان وہی پرچہ میرا لیکر آئے، مجھ کو دیا میں سمجھا جواب ہے، اس کو کھول کر دیکھنے لگا، اتنے
میں وہ پھر غائب ہو گئے، میں نے خیال کیا، کہ صاحبزادہ صاحب نے جواب لکھنا مناسب نہیں جانا، اسی
پرچہ پھیر دیا ہے یہ اشارہ اسبات کا ہے، کہ ملنا غیر ممکن ہے، واپس جاؤ، میں جواب ملنے ہی کو غنیمت
سمجھ کر باہر سے مرزا صاحب و حضرت شاہ غلام علی صاحب کی روح پر فتوح پر فاتحہ پڑھکر واپس
آیا، دو بجے قیام گاہ پر پہنچا، آتے ہی کھانا کھایا، اب پانی اس شدت کا برس رہا ہے، کہ تار ہی
نہیں ٹوٹتا، گویا ساون بھادوں کا مہینہ ہے، جھڑی لگ گئی ہے، خدا خیر کرے، اگر یہی حال
رہا تو کوئی کام پورا نہ ہو سکے گا،

سند مولوی نذیر حسین صاحب

روز سہ شنبہ ۲۴ رجب، آج بارش کے آثار نہیں ہیں، صبح کو حوائج ضروری

سے فارغ ہوکر مولوی نذیر حسین صاحب کی درسگاہ گیا حسب معمول گیارہ بجے تک شریک درس رہا، اس کے بعد
قیام گاہ پر واپس آیا، دو بجے بازار گیا، کچھ چیزیں لینی تھیں، وہ چیزیں لیں عصر کی نماز فتحپوری میں پڑھی، اس کے
بعد پھر مولوی نذیر حسین صاحب کی مسجد پر آیا، مولوی صاحب آئے نہ تھے، تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے میں
نے ذکر کیا کہ اب میرا ارادہ جانے کا بہت جلد ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھ کو اجازت آپ بھی عنایت
کریں، سن کر فرمایا بہت اچھا بہت بہتر ہے، آپنے جو جو کتابیں حدیث کی پڑھی ہیں، وہ سب لکھ لائیے
میں لکھ دوں گا، اسکو بہت خوشی کے ساتھ کئی بار کہا، بہت اچھا "بہت بہتر ہے" میں ضرور لکھدوں گا، اس
وقت مجھ کو بہت افسوس ہوا، کہ میں اپنی سند حدیث کی لیتا نہ آیا، ورنہ وہی دکھا دیتا، اسی پر وہ بھی لکھ دیتے،
مجھ کو اس بات کا بہت ہی افسوس ہے، میں ان کے پاس مغرب تک بیٹھا رہا، باتیں کرتے رہے، میں
نے پوچھا، کہ آپ نے سید[1] صاحب کو دیکھا ہے، کہنے لگے، ہاں دیکھا ہے، جب وہ سفر کلکتہ سے لوٹے تھے
اس وقت میں نے پٹنہ میں ان کو دیکھا ہے، اس زمانہ میں میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا، اس کے بعد سید صاحب
دہلی آئے، یہاں بہت کم ٹھہرے، مولینا محمد اسمٰعیل[2] صاحب ٹھہر گئے تھے، قریب پانچ چھ مہینہ کے یہاں
رہے، جب مٹکاف صاحب کلکتہ سے آئے، تو وہ یہاں سے استعجالاً چلے گئے، کیونکہ کلکتہ میں اس سے
اور مولینا سے کچھ بحث ہو گئی تھی، معلوم ہوا کہ مولوی صاحب[3] دہلی کے اصل باشندہ نہیں ہیں، صوبہ بہار
کے رہنے والے[4] ہیں، مغرب کی نماز میں نے وہیں پڑھی، اس کے بعد قیام گاہ پر واپس آیا،

شیخ احمد پائی کی سرائے

روز چہارشنبہ ۲۵ رجب صبح کو اٹھ کر نماز و تلاوت و حوائج ضروری سے فراغت
کرکے درسگاہ گیا، معلوم ہوا کہ آج میاں صاحب کی کہیں دعوت ہے، اس وجہ سے نہیں آئے، درس
نہ ہوگا، وہاں سے واپس آتے ہوئے شیخ احمد پائی کی سرائے دیکھی نہایت صاف و دلکشا ہے، اس

[1] سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ [2] مولینا شاہ اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ [3] مولوی سید نذیر حسین صاحب
[4] مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی مشہور تھے، مگر ان کا اصلی وطن سورج گڑھا ضلع مونگیر صوبہ بہار تھا،

بہت ہیں، اس وجہ سے ہم لوگ چپ ہیں، لوگوں نے تکفیر کے فتوے لکھ لکھکر بکس میں ڈال دیئے، مگر ان کو کچھ تنبہ نہیں ہوتا، غرباے تو ملتے ہی نہیں کسی کسی سے جس کو وہ کچھ سمجھتے ہیں، مل لیتے ہیں، جب بیمار ہوتے ہیں، تو آخر حکیم کو بلاتے ہیں، اکثر خود ان کی طبیعت ناساز رہتی ہے، ان کی دو بچیاں ہیں بیوی ہیں وہ علیل ہوتی رہتی ہیں، حکیم کو بلاتے ہیں، حکیم کو بلانے کے واسطے اور کسی شخص کو بلاتے ہیں تاہم عام طور پر نہیں ملتے اکی ابتدار تو چار برس سے پڑ چلی تھی، لیکن اب انتہا رہو گئی، ان بزرگ کا نام عبدالرحیم ہے، ۱۲۴۱ھ میں دہلی آئے، جب سے یہیں رہتے ہیں، چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے میں آپ کی کیا تواضع کروں، کچھ نقل چرونجی دانہ کشمش رکھی تھیں، وہ لاکر دیں اور کہا کہ فاتحہ کے تبرک ہیں، ان کے پاس سے اٹھ کر پھر میں باہر آیا، محمد علی خان نہ تھے، ایک مسجد وہاں سے بہت قریب ہے، وہاں جاکر لیٹا رہا، وہی تبرک کھایا پانی پیا، کچھ تسکین ہوئی، میرا خیال تھا کہ آج جواب ہست نیست کا مل جائے، تو روز روز کی دوادوش سے نجات ہو، خانقاہ شریف میرے قیام گاہ سے بہت دور ہے، وہ شہر کے اس کنارہ ہے، اور میں شہر کے اس کنارہ اسٹیشن کے پاس ٹھہرا ہوں، ظہر کی نماز اسی مسجد میں پڑھی، اس کی تھوڑی دیر بعد محمد علی خان وہی پرچہ میرا لیکر آئے، مجھ کو دیا میں سمجھا جواب ہے، اس کو کھول کر دیکھنے لگا، اتنے میں وہ پھر غائب ہوگئے، میں نے خیال کیا، کہ صاحبزادہ صاحب نے جواب لکھنا مناسب نہیں جانا، اور پرچہ پھیر دیا ہے یہ اشارہ اسبات کا ہے، کہ ملنا غیر ممکن ہے، واپس جاؤ، میں جواب ملنے ہی کو غنیمت سمجھ کر باہر سے مرزا صاحب وحضرت شاہ غلام علی صاحب کی روح پر فتوح پر فاتحہ پڑھکر واپس آیا، دو بجے قیام گاہ پر پہنچا، آتے ہی کھانا کھایا، اب پانی اس شدت کا برس رہا ہے، کہ تار ہی نہیں ٹوٹتا، گویا ساون بھادوں کا سامہینہ ہے، جھڑی لگ گئی ہے، خدا خیر کرے، اگر یہی حال رہا تو کوئی کام پورا نہ ہوسکے گا،

سند مولوی نذیر حسین صاحب

روز سہ شنبہ ۲۴ رجب، آج بارش کے آثار نہیں ہیں، صبح کو حوائج ضرو

سے فارغ ہوکر مولوی نذیر حسین صاحب کی درسگاہ گیا جب معمول گیارہ بجے تک شریک درس رہا، اس کے بعد قیام گاہ پر واپس آیا، دو بجے بازار گیا، کچھ چیزیں لینی تھیں، وہ چیزیں لیں عصر کی نماز فتحپوری میں پڑھی، اس کے بعد پھر مولوی نذیر حسین صاحب کی مسجد پر آیا، مولوی صاحب آئے نہ تھے، تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے میں نے ذکر کیا کہ اب میرا ارادہ جانے کا بہت جلد ہے، میں چاہتا ہوں کہ مجھ کو اجازت آپ بھی عنایت کریں، سن کر فرمایا بہت اچھا بہت بہتر ہے، آپنے جو جو کتابیں حدیث کی پڑھی ہیں، وہ سب لکھ لائیے میں لکھ دوں گا، اسکو بہت خوشی کے ساتھ کئی بار کہا، بہت اچھا "بہت بہتر ہے، میں ضرور لکھدوں گا" اس وقت مجھ کو بہت افسوس ہوا، کہ میں اپنی سند حدیث کی لیتا نہ آیا، ورنہ وہی دکھا دیتا، اسی پر وہ بھی لکھدیتے، مجھ کو اس بات کا بہت ہی افسوس ہے، میں ان کے پاس مغرب تک بیٹھا رہا، باتیں کرتے رہے، میں نے پوچھا، کہ آپ نے سید[۵۱] صاحب کو دیکھا ہے، کہنے لگے، ہاں دیکھا ہے، جب وہ سفر کلکتہ سے لوٹے تھے اس وقت میں نے پٹنہ میں ان کو دیکھا ہے، اس زمانہ میں میں یوسف زلیخا پڑھتا تھا، اس کے بعد سید صاحب دہلی آئے، یہاں بہت کم ٹھہرے، مولینا محمد اسمٰعیل[۵۲] صاحب ٹھہر گئے تھے، قریب پانچ چھ مہینہ کے یہاں رہے، جب مشکاف صاحب کلکتہ سے آئے، تو وہ یہاں سے استعجالاً چلے گئے، کیونکہ کلکتہ میں اس سے اور مولینا سے کچھ بحث ہوگئی تھی، معلوم ہوا کہ مولوی صاحب[۵۳] دہلی کے اصل باشندہ نہیں ہیں، صوبہ بہار کے رہنے والے[۵۴] ہیں، مغرب کی نماز میں نے وہیں پڑھی، اس کے بعد قیام گاہ پر واپس آیا،

شیخ احمد پائی کی سرائے

روز چہار شنبہ ۲۵ رجب صبح کو اٹھ کر نماز و تلاوت و حوائج ضروری سے فراغت کر کے درسگاہ گیا، معلوم ہوا کہ آج میاں صاحب کی کہیں دعوت ہے، اس وجہ سے نہیں آئے، درس نہ ہوگا، وہاں سے واپس آتے ہوئے شیخ احمد پائی کی سرائے دیکھی نہایت صاف و دلکشا ہے، اس

---

[۵۱] سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ [۵۲] مولینا شاہ اسمٰعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ [۵۳] مولوی سید نذیر حسین صاحب

[۵۴] مولوی سید نذیر حسین صاحب دہلوی مشہور تھے، مگر ان کا اصلی وطن سورج گڑھا ضلع مونگیر صوبہ بہار تھا،

سے ملحق ایک مسجد ہے، اس میں پیرجی عبدالرزاق صاحب مولینا رشید احمد صاحب کے مریدوں میں ہیں، ان سے
ملنے گیا وہ نہ تھے، وہاں سے واپس آیا،

مولوی سلیم الدین خاں بن مولوی رشید الدین خاں

ارادہ ہوا کہ آج مولوی سلیم الدین خانصاحب سے مل آؤں، یہ مولوی رشید الدین
خاں صاحب مرحوم کے صاحبزادے ہیں، ان کے یہاں پرانا کتب خانہ اچھا ہے،
اور شاید چھاپا بھی کرتے ہیں، ان کا مکان دریافت کیا معلوم ہوا، کہ بلیلے خانہ میں ہے، اور وہ دریبہ خرد
میں ہے، اس پتہ سے میں دریبہ خرد میں پہونچا، وہاں دریافت کیا، تو معلوم ہوا کہ بلیلے خانہ چتلی قبر سے
آگے کالی مسجد کے قریب ہے، یہ بھی دریافت ہوا کہ مولوی سلیم الدین صاحب کا دو مہینہ ہوئے انتقال
ہوگیا، ان کے ایک صاحبزادے تھے رضی الدین خان ان کا مولوی صاحب مرحوم کے سامنے ہی انتقال
ہوچکا تھا، ان کی اولاد خرد سال ہے، مجھکو نہایت ہی افسوس ہے،

مدرسہ حسین بخش

اب وہاں جانا بے لطف سمجھ کر یہ ارادہ کیا، کہ شیخ حسین بخش کے مدرسہ کی سیر کرنی چاہئے
یہ مدرسہ جامع مسجد بازار میں بختاور خان کی حویلی کے آگے ہے، وہیں سے روشن الدولہ کے کٹرہ ہوتا
ہوا، سیدھا جامع مسجد کے پاس آنکلا، اور جامع مسجد کے پشت پر ہو کر جامع مسجد بازار پہونچا، مدرسہ نہایت
پر تکلف ہے، مسجد ہے، اور مسجد کے گرد اسی سے ملحق مکانات وحجرے خوبصورتی کیساتھ بنے ہوئے ہیں
ان میں مدرسین اور طلبہ رہتے ہیں، مدرسہ کا خرچ دو سو روپیہ ماہوار ہے، آمدنی کا کوئی کافی ذریعہ نہیں
ہے، چندہ سے چلتا ہے، کچھ محدود آمدنی مقرر بھی ہے، چار مدرس ہیں اور پانچ مددگار،

مولوی عبدالعلی صاحب

مدرس اول مولوی عبدالعلی صاحب ہیں، یہ مسجد کے شرقی وجنوبی گوشہ کے مکان
میں رہتے ہیں، وہیں درس دیتے ہیں، ذی الحجہ سنہ حال سے یہاں آئے ہیں، پیشتر مراد آباد و
سہارنپور میں مدرس تھے، مولوی فیض الحسن ومولانا محمد قاسم ومولینا احمد علی صاحب مرحومین کے شاگرد
ہیں، مولینا محمد قاسم صاحب سے زیادہ تر تلمذ ہے، انہی کی صحبت میں زیادہ رہے ہیں، انہی سوادات

ہے، آدمی خلیق سنجیدہ بے تکلف سادہ مزاج ہیں، خودداری وپندار سے بالکل کنارہ کش صورت کو
علمائے دین کی شان معلوم ہوتی ہے، جب میں گیا تو صحیح مسلم کا سبق ہوچکا تھا، طلبہ سے باتیں کررہے تھے،
مجھ سے نہایت شگفتہ پیشانی کے ساتھ ملے تعارف کے بعد مجھ سے کہا، اگر اجازت ہو تو میں ایک سبق
اور پڑھا دوں، اس کے بعد سنن ابن ماجہ کا سبق شروع ہوا، دیر تک پڑھاتے رہے، اس اثناء میں میں
اٹھا، مجھ سے کہا کہ آپ تھوڑی تکلیف اور کیجئے، میں بیٹھ گیا، تھوڑی دیر میں سبق ختم کیا، اور طالبعلموں
سے کہدیا کہ باقی سبق سہ پہر کو ہوں گے، پھر مجھ سے نہایت لطف اور بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے،
میرے واسطے چار بنوائی، اور اصرار کیساتھ پلاتے رہے، پان خود نہیں کھاتے، مگر میرے واسطے خاص
منگوائے، باوجود اس کے کہ میں منع کرتا رہا، ان کے اس تواضع واکرام کی وجہ سے میں زیادہ بیٹھا، بارہ
مجھکو وہیں بج گئے، دیر تک حضرت سید صاحب کے حالات ذکر کرتے رہے، مولینا قاسم صاحب کے حالات بیان
کرتے رہے، یہ بھی کہا کہ اگر مولینا قاسم صاحب کے حالات اور ان کے علم کا مشاہدہ میں نے خود نہ کیا ہوتا
تو اگلے زمانہ کے اکابر کے حالات افسانہ معلوم ہوتے، مولینا رشید احمد صاحب کے نسبت کہنے لگے، کہ
ایسے لوگ اب روی زمین پر ڈھونڈنے سے نہیں ملیں گے، یہ بھی قصہ انہوں نے بیان کیا، کہ مولوی
سعید الدین ایک معمولی استعداد کے آدمی سید صاحب کے دیکھنے والوں میں ان کے قافلہ کے تھے،
سہارنپور میں رہتے تھے، وہ بھی جیسا سید صاحب غفران مآب کے علی العلوم مریدوں کا حال ہے، نہایت
باخدا اور سچے مسلمان تھے، ان کے بیٹے سے کسی دوسرے شخص سے جھگڑا ہوگیا، اور نوبت بعدالت
پہنچی، فریق ثانی نے مولوی صاحب کو گواہی میں لکھا دیا، مولوی صاحب کو جانا پڑا، اور بلا لحاظ واسطہ
پدری کے اپنے بیٹے کے مخالف گواہی دی، وہ آخر میں نابینا ہوگئے تھے، اور باوجود پیرانہ سالی کے
ہر روز کسی بچہ کو ساتھ لیکر مدرسہ پڑھنے آیا کرتے تھے، کچھ سنتے تھے، کچھ پڑھتے تھے، ہمیشہ ان کا یہ شغل
رہا، میں نے ایسے وقت میں دیکھا ہے، کہ نابینا ہوجانے کے بعد اون کی آنکھیں روشن ہوچکی تھیں، اور

خود بلا وساطت کسی کے پھرتے تھے، اس کا قصہ مولوی ثابت علی صاحب عجیب بیان کرتے تھے، وہ بھوپال
میں مدرس ہیں، اور میرے دوستوں میں ہیں، وہ کہتے تھے، کہ مولوی صاحب مرحوم اکثر کلام مجید پڑھا
کرتے تھے، اور رویا کرتے تھے، ایک مرتبہ میں دیکھتا کیا ہوں کہ وہ خود بخود چلے آرہے ہیں، ان کی آنکھیں
روشن ہیں، میں نے پوچھا حضرت یہ کیا بات ہے، معلوم ہوا کہ آج بھی حسب معمولی کلام مجید پڑھ رہے تھے،
اور رو رہے تھے، آنسو جیسے ہی پونچھے آنکھیں روشن تھیں،

یہ بھی قصہ مولوی عبد العلی صاحب نے بیان کیا، کہ سبزی منڈی یہاں سے بہت قریب ہے، اس
محلہ میں ایک مولوی صاحب آکر رہتے تھے، وہ غیر مقلد تھے، دن کو میاں صاحب کے مدرسہ میں رہتے
تھے، اور رات کو وہاں کرایہ سے مکان تھا، اس میں ایک بیوی صاحب بھی تھین، اسی محلہ میں ایک
کبیر السن میاں جی رہتے تھے، وہ پابند اوقات تھے، محلہ کے لوگ ان کی تعظیم کرتے تھے، ایک دن ایک
بڑھیا نے ان سے آکر کہا کہ مولوی صاحب کی بیوی نے آپ کو بلایا ہے، کھڑے کھڑے ذری کی ذری
سن جائیے، میاں جی صاحب گئے، پردے کے پاس بیوی صاحب نے آکر کہا کہ آپ باخدا آدمی ہین
مجھ کو لللہ اس ظالم کے پنجہ سے چھڑائیے، انھوں نے کہا خیر ہے، اس نے کہا خیر کہان شر ہے، یہ میرا
پیر ہے، میں اس کی مرید، میرے خاوند موجود ہیں، دھوکہ سے یہ مجھکو نکال لایا ہے، میاں جی صاحب
کو سُن کر نہایت ہی تعجب ہوا، اور واقعی تعجب کی بات ہے، میں نے یہاں تک جب قصہ سُنا، تو
مجھکو عجب حیرت ہوئی، مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میانجی نے اسکی تسلی تشفی کی، اس کے بعد چلے
آئے، لیکن موقع کے منتظر رہے، ایک دن مولوی صاحب سے خلوت میں کہا کہ مجھکو تنہائی میں آپ سے
ایک راز کہنا ہے، بشرطیکہ وہ کسی پر ظاہر نہ ہونے پائے، آپ تک رہے، انھوں نے کہا فرمائیے
میاں جی صاحب نے کہا کہ میں بھی آپ کا ہم مذہب ہون، مگر حضرت کیا کہئے اس محلہ کے لوگ ایسے سخت
ہیں، آپ جانتے ہیں، کہ یہ لوگ آدمی مار ڈالتے ہیں، اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی، اگر میں ظاہر

کردن، تو خدا جانے میری کیا حالت ہو، مولوی صاحب نے کہا خیر یہ بہت مناسب ہے، اب آپ اپنا
مطلب کہئے انھون نے کہا اصل یہ ہے کہ اس محلہ میں ایک عورت سے مجھ کو کمال درجہ کی الفت ہے،
لیکن اس کے خاوند موجود ہے، میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی تدبیر ہو کہ وہ میرے قابو میں آجائے
اور شریعت میں بھی جائز ہو، انھوں نے کہا کہ یہ کوئی دشوار امر نہیں ہے، یہ لوگ یعنی حنفی المذہب مستحل الدم
ہیں، ان کا مال مال غنیمت ہے، ان کی بیویاں ہمارے واسطے جائز ہیں[1]، آپ قابو میں لا سکتے ہون
تو شوق سے لائے، انھون نے کہا بس مجھکو یہی چاہیے تھا، اور وہان سے چلے گئے، دوسرے وقت
محلہ کے عمائد سے یہ قصہ بیان کیا، اور یہ شرط کرلی کہ ان کو جان سے نہ ماریں، ان لوگوں نے اس کے
خاوند کو بلا بھیجا، جب مولوی صاحب نماز کے واسطے آگے بڑھے تو ایک شخص نے نہایت درشتی کے
ساتھ ان کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا، اور نہایت ہی مرمت کی، اور خاوند اپنی جورو کو لیکر چلا گیا، یہ قصہ حال
ہی کا ہے، مجھ کو اس کے سننے سے عورت کے نکال لانے پر اتنا استعجاب نہیں ہوا، جتنا ان کے حنفیہ کے
مستحل الدم سمجھنے پر تعجب ہوا، باوجودیکہ اس میں کچھ نہیں ہے، بھوپال میں عبد اللہ نابینا کہتا ہے کہ
دنیا میں صرف ڈھائی مسلمان ہیں، مولوی محمد بشیر صاحب حنفیہ کو مشرک سمجھتے ہیں، القصہ دو بجے
میں وہاں سے آیا، آکر کھانا کھا کر نماز پڑھی، اس کے بعد مولوی نذیر حسین صاحب کے یہاں گیا، اس
وقت بھی درس نہیں ہوا، وہاں سے آکر چاندنی چوک گیا، کچھ چیزیں لینی تھیں، یہاں یہ بات علی
العموم دیکھی گئی، کہ دوکاندار قیمت زیادہ نہیں کہتے، اور اکثر ایک ہی بات کہتے ہیں، لکھنؤ میں اور یہاں
دونے کا بل ہے وہاں سے آکر غازی الدین خان کی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھکر قیام گاہ پر آگیا،

سند حدیث کی عبارت | روز پنجشنبہ ۲۶ رجب صبح کو اٹھکر حوائج ضروری سے فارغ ہو کر درسگاہ

[1] اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ اس زمانہ میں احناف اور اہل حدیث کے تعلقات کتنے کشیدہ
تھے، اور آپس کی بدگمانیاں کس حد تک بڑھی ہوئی تھیں،

گیا، ترجمہ ہو چکا تھا، اس کے بعد جتنے سبق ہوئے، سب سُنے جب مولوی صاحب گھر جانے لگے، تو میں
نے وہ پرچہ دیا، جس میں اپنے حدیث پڑھنے کا حال لکھا تھا، اس کا مضمون یہ ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم وبہ نستعین الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ
الذین اصطفی وبعد فانی قرات علی شیخنا العلامۃ النور الساری حسین بن محسن
السبعی الانصاری اولیات الشیخ محمد سعید السنبل والحصن الحصین للجزری
وبلوغ المرام للحافظ ابن حجر العسقلانی ومسلسلا بہ والامہات الاربع
اعنی بہا الجامع الکبیر لابی عیسی الترمذی والجامع الصحیح لشیخ الاسلام
البخاری والصحیح للامام مسلم بن الحجاج النیشاپوری والسنن لابی
داؤد السجستانی وسمعت بحق قراۃ الغیر علیہ طرفا من السنن
للنسائی وابن ماجۃ القزوینی واجازنی لکل ما یجوز لہ روایتہ
ویصح عنہ درایتہ عن المشائخ الکرام الاجلۃ الاعلام اجلہم
السید الشریف الحمید العلامۃ العفیف ذی المنہج الاعدل
حسن بن عبد الباری الاہدل عن آبائہ السادۃ ومشائخہ القادۃ
ونسخۃ الشریف العلامۃ محمد بن ناصر الحازمی والشیخ العلامہ
احمد بن محمد بن علی الشوکانی عن والد الثانی سند القطر الیمانی
شیخ الاسلام محمد بن علی الشوکانی عن الامام الہمام احمد بن
عبد القادر الکوکبانی رضی اللہ عنہم وعنا اجمعین الی آخر السند
المثبوت المحفوظ عندی بخط شیخنا متعنا اللہ بحیاتہ،

افسوس ہو کہ اگر سند موجود ہوتی، تو مجھکو اس عبارت کے لکھنے کی حاجت نہ پڑتی بہرحال

مولوی صاحب نے وہ پرچہ لیکر رکھ لیا، اور میں قیام گاہ پر واپس آیا،

پیرجی عبد الرزاق ظہر کی نماز پڑھکر احمد پائی کی مسجد میں پیرجی عبد الرزاق صاحب سے ملنے گیا، یہ بزرگ گنگوہ کے رہنے والے مولینا سلمہ اللہ تعالی[1] کے مریدون میں ہیں، دہلی میں سترہ برس سے رہتے ہین، ملاقات ہوئی، بیٹھے کلام مجید کی تلاوت کر رہے تھے، آدمی بہت معقول ہیں، جب تک صحبت رہی بزرگوں کا تذکرہ کرتے رہے، مجھ سے نہایت حسن ظن کیساتھ پیش آئے،

سندِ حدیث پر تصدیق تھوڑی دیر کے بعد مین واپس آیا، اور سند کے خیال میں مولینا نذیر حسین صاحب کے یہان چلا، راستہ ہی میں وہ مل گئے، ڈولی پر کہین جا رہے تھے، ایک خادم ساتھ تھا، مجھ سے کہا کہ میں تمہاری سند لکھ کر قرآن شریف میں رکھکر آیا ہون، مسجد میں جا کر لیلو، میں مسجد گیا، سند رکھی ہوئی تھی، لیکر قیام گاہ پر واپس آیا، خلاصہ مضمون سند کا یہ ہے:۔

اِنّ المولوی عبد الحیٔ بن السیّد فخر الدّین الحسنی قد قرأ الصحاح السّتۃ
ومُلحِقاتِہا، علی العلامۃ المحدث حسین بن محسن السبعی الانصاری و
طلب منّی ایضاً سندھا لزیادۃ الوثوق فاجزت لہٗ باقراء الکتب المذکورۃ
وتدریسہا لانہ اہلہا واحق بہا،

میان صاحب نے اپنے حُسن ظن سے یہ فقرہ سند میں بڑھا دیا ہے، لِانّہ اہلہا واحق بہا
یعنی یہ اس کے اہل، اور سب سے زیادہ حقدار ہیں، ورنہ ایسی صورت مین قاعدہ محدثین کا یہ ہے کہ یہ فقرہ لکھتے ہیں، بالشرط المعتبر عِندَ اَہل الحدیث والاثر یعنی اس شرط کے ساتھ جو اہل حدیث کے نزدیک معتبر ہے، والحمد للہ علی ذلک،

مدرسہ شاہ عبد العزیز صاحب وہان سے آنے کے بعد مین نے یہ ارادہ کیا، کہ حضرت مولینا و مولی الکل مقتدائے ارباب رشد و تمیز شاہ عبد العزیز روح اللہ شبوخہ کے مدرسہ کی زیارت کروں، جس میں ہمارے بزرگوں

[1] مولینا رشید احمد صاحب،

نے یکے بعد دیگرے استفادہ کیا ہے، اور جس کی خاکروبی کو فخر و سعادت سمجھا ہے، حضرت شاہ محمد وانیح قدس
سرہٗ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے وقت میں تشریف لائے، ان کے بعد شاہ ابو سعید صاحب، مولوی محمد نور
صاحب، حضرت سید محمد معین صاحب یکے بعد دیگرے آئے، اس کے بعد شاہ عبدالعزیز صاحب کے زمانہ
میں حضرت مولینا شاہ سید قطب الہدی صاحب تشریف لائے، ان کے بعد مولینا سید محمد اسحاق صاحب، ان
کے بعد حضرت مولینا سید احمد صاحب قدس اللہ اسرارہم آئے، اور فائدہ حاصل کیا جسکو تمام عالم جانتا ہے،

یہاں سے جامع مسجد اور اس کے آگے چتلی قبر تک گیا، چتلی قبر سے دو راستے ہیں، ایک داہنے
ہاتھ کو وہ سیدھا خانقاہ کو گیا ہے، دوسرا بائیں ہاتھ کو اس راستہ پر بہت دور تک چلا گیا، آگے بڑھکر
بائیں ہاتھ کو کوچۂ فولاد خان کو سڑک گئی ہے وہ سیدھی کلاں محل تک چلی گئی ہے، کلاں محل میں ہمارے شیخ
المشائخ مولینا و مقتدانا رحمہ اللہ تعالیٰ کا مدرسہ ہے، اسکی حالت دیکھ کر خاویۃ علی عروشہا انی یحیی ھذہ
اللہ بعد موتہا کی آیت یاد آئی، اللہ اللہ کیا کارخانہ قدرت کی نیرنگیاں ہیں، ایک وہ دن تھا کہ عرب و
عجم کے لوگ اس مدرسہ میں رہتے تھے، اور فائدہ حاصل کرتے تھے اور آج اسکی یہ حالت ہے کہ ویران خراب پڑا ہوا ہے کوئی رہنے والا نہیں،

شاہ صاحب کی یادگار | مدرسہ میں پہنچکر میں نے مولوی سید ظہیر الدین احمد کو تلاش کیا، وہ زنانخانہ کے قریب
کسی مکان کی تعمیر کرا رہے تھے، میں وہاں گیا، اور حضرت شاہ صاحب کے زنانہ مکان کے باہر سے زیارت
کی، اسکے بعد مولوی صاحب ملے، تعارف ہوا، اور وہاں سے کمرہ میں آکر بیٹھے، پہلے انھوں نے اس بات کی
بڑی شکایت کی، کہ آپ سرائے میں کیوں ٹھہرے اور اسی وقت آدمی کو بھیجنے لگے کہ اسباب اٹھا لائے، لیکن میں
نے معذرت کی اور کہا کہ میں کل جانیوالا ہوں اب اگر اتفاق حاضر ہونیکا ہوگا تو یہیں ٹھہروں گا، مجھ کو اجنبیت
کی وجہ سے معلوم نہ تھا، تاہم وہ بہت دیر تک بجائے مخدومانہ شکایت کے برادرانہ شکایت کرتے رہے،
پھر اس بات پر مصر ہوئے کہ کل دعوت ہے، اسکو قبول کیجئے، میں نے اس میں بھی معذرت کی، کیونکہ
اس وقت میرا قطعی ارادہ کل کے جانے تھا، آخر کو انھون نے مجبور ہو کر کہا کہ آج ہی شب کو کھانا یہاں

کھاؤ، میں نے زیادہ انکار مناسب نہیں سمجھا، اور ان کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا، یہ بزرگ شاہ صاحب کے
خاندان سے اس طور پر واسطہ رکھتے ہیں کہ ان کے دادا جناب شاہ رفیع الدین صاحب کے نواسہ تھے، حضرت
شاہ رفیع الدین صاحب کے چھ صاحبزادے تھے، مولوی مخصوص اللہ، مولوی موسیٰ، مولوی مصطفےٰ وغیرہ،
ان کے اب کسی کے اولاد نہیں ہے، ایک صاحبزادی تھیں بوبی امۃ اللہ انکے دو صاحبزادے تھے سید ناصر الدین اور سید نصیر الدین،
آخر الذکر مولینا محمد اسحٰق صاحب کے داماد تھے، جو مولینا نصیر الدین مجاہد کے نام سے مشہور ہیں، ان کی اولاد
نہیں چلی، اور اول الذکر کے ایک صاحبزادے تھے سید معز الدین ان کے صاحبزادے ہیں سید ظہیر الدین احمد،
انھون نے اس بات کی کوشش کی ہے، کہ ان حضرات کی تصانیف شائع کیجائیں، چنانچہ اکثر رسائل چھپوائے
ہیں، اور باقی چھپ رہے ہیں، ایک پریس بھی قائم کیا ہے، ابتدا میں خاص حضرت مولینا علیہ الرحمہ کے مدرسہ
میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا، مگر ابنائے زمانہ کی بے التفاتی سے وہ ٹوٹ گیا، آج کل انتباہ چھپ کر
تیار ہو گئی ہے، اب حضرت شاہ اہل اللہ صاحب کا مطب چھپ رہا ہے، یہ بہت بڑے حکیم بھی تھے، کچھ
کتابیں دکھانے کو گھر سے لائے، ایک مجموعہ جس میں حضرت شاہ ولی اللہؒ حضرت شاہ اہل اللہ حضرت شاہ
عبدالعزیز صاحب کے مکتوبات تھے، جو باہم علمائے معاصرین سے کتابت ہوئی تھی، حضرت ابو طاہر مدنی و
سید محمد حسین سیدلے و بابا عثمان بن فاروق کشمیری کے بھی خطوط تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز و سید حسین سیدلے
کے خطوط ادبار کے واسطے قابل دید ہیں، قول الجمیل بھی اس مجموعہ میں تھی، اس کے حواشی کے نسبت وہ کہتے
تھے، کہ خاص جناب مصنف علیہ الرحمہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں، بدور البازغہ بھی دیکھنے میں آئی، ایک رسالہ
ملا محب اللہ بہاری کا فطرۃ الالٰہیہ تھا، بدور البازغہ حجۃ اللہ البالغہ کے انداز کا رسالہ ہے حکمت الٰہی میں [1]

شاہ صاحب کا خاندانی مقبرہ، | ان سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مہندیون میں حضرت شاہ صاحب کے تمام خاندان کے مزار
ہیں، شاہ عبدالغنی صاحب بھی وہیں مدفون ہیں، اور حضرت شاہ رفیع الدین صاحب کے

[1] یہ رسالہ اب چھپ گیا،

سب صاحبزادے اور مولینا اسمٰعیل صاحب کے فرزند رشید مولوی محمد عمر صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب
کی والدہ ماجدہ اور مہندیوں کو جاتے ہوئے، راستہ میں سڑک سے کچھ فاصلہ پر حضرت شاہ عبدالر
شکر بار کا مقبرہ ہے، جو حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کے نانہالی اجداد میں ہیں، افسوس ہے کہ یہ خا
اسی طرف سے گیا، اور اس مقبرہ میں پہنچکر طبیعت بہت لگی، اور دیر تک وہاں کھڑا رہا، لیکن یہ نہ معلوم ہوا
کہ حضرت شکر بار کا یہیں مزار ہے، مجھ سے بہت بڑی غلطی یہ ہوئی، کہ پہلے مدرسہ جا کر ان بزرگ سے
ملاقات نہیں کی، ورنہ یہ اجنبیت نہ رہتی،

شاہ صاحب کا اصل وطن

یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حضرات اصل باشندہ رہتک کے ہیں، شاہ عبدالرحیم صاحب
کے والد ماجد شاہ وجیہ الدین صاحب دہلی تشریف لائے، ان کے بعد شاہ عبدالرحیم صاحب نے یہیں
قیام قبول کرلیا، شاہ عبدالرحیم مہندیوں میں رہتے تھے، پہلے وہاں آبادی تھی، جہاں ان کے مزار
یہ خاص حجرہ شاہ عبدالرحیم صاحب کا تھا، وہاں مدرسہ بھی تھا، اور مسجد بھی، وہ سب مندرس ہوگئی،
مسجد جواب ہے، یہ شاہ اسحاق صاحب کے وقت میں کسی ارادتمند نے بنوا دی ہے، احاطہ مزار
بالکل شکست ہوگیا ہے، شاہ عبدالرحیم کے بعد شاہ ولی اللہ صاحب نے شہر میں تشریف لا
یہ مدرسہ ان کو دیا گیا، اور یہیں رہ پڑے، شاہ عبدالرحیم صاحب کی پہلی شادی سونی پت میں ہوئی تھی
ان سے ایک صاحبزادے ہوئے اصلاح الدین، ان سے اولاد نہیں چلی، دوسری شادی ساٹھ برس
کی عمر میں حضرت قطب الدین بختیار کاکی کی بشارت کے موافق پھلت میں اپنے ایک مرید کے یہاں
کی، ان سے دو صاحبزادے ہوئے، شاہ ولی اللہ اور شاہ اہل اللہ، پھلت والوں کا خاندان صدیقی
اور شاہ صاحب کا فاروقی، شاہ اہل اللہ ہمیشہ نانہال میں رہتے، قرابت اس خاندان کی ہمیشہ
کے سیدوں میں یا پھلت کے صدیقیوں میں ہوا کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب کی بھی دو شادیاں ہو
پہلی پھلت میں ہوئی، شیخ محمد صاحب کی بیٹی سے، جن کے پوتے ہیں شاہ محمد عاشق صاحب ان

ایک صاحبزادے ہوئے شیخ محمد صاحب وہ بھی ہمیشہ پھلت میں رہے، دوسری سید ثناء اللہ کی بیٹی سے
ہوئی، ان سے چار صاحبزادے ہوئے، جو دین کے چار ارکان یا جسد علم کے اربع عناصر تھے، ان حضرات کے
حالات بہت دیر تک مولوی صاحب بیان کرتے رہے، میں نے مغرب کی نماز وہیں پڑھی، پھر کھانا کھا
بھی تھوڑی دیر بیٹھا، مولوی صاحب ان حضرات کے حالات میں ایک کتاب لکھ رہے ہیں، وہ دیر
تک سنتا رہا، اس کے بعد میں نے خدا حافظ کہا، لیکن مولوی صاحب باوجود میرے انکار کے گلی کے
نکڑ تک مشایعت میں آئے، وہاں سے اپنا آدمی لالٹین لیکر ساتھ کر دیا، چلتے وقت مجھ سے [illegible]
کی فرمایش کی، اور میں رخصت ہوکر روانہ ہوا، جامع مسجد کے قریب میں نے ان کے آدمی کو رخصت
کیا، کیونکہ لالٹینیں سڑک پر روشن تھیں، اور راستہ بھی مجھکو معلوم تھا،

جامع مسجد میں واعظوں کے دنگل،

روز جمعہ، ۲ رجب، آج صبح سے دوپہر تک قیام گاہ میں رہا، دوپہر کو
کھانا کھا کر جامع مسجد نماز کے واسطے گیا، نماز کے بعد چار جگہ وعظ ہونے لگا،
منبر پر مولوی محمد اکبر وعظ کہتے ہیں، یہ بزرگ حنفیوں کا خوب خاکہ اڑاتے، دل کھولکر تبرا کرتے ہیں
اس بات پر فخر کرتے ہیں، کہ ہدایہ پڑھانے سے توبہ کی ہے، فرماتے تھے، "کہ آج کون ہے، کہ جس
نے ہدایہ پڑھانے سے توبہ کرکے کلام مجید کی تعلیم شروع کی ہو، سب جہنم میں جائیں گے" اور وعظ
میں ہر ہر بات پر اپنی بڑائی کرتے ہیں، ہر آیت کو اہل دہلی اور اپنے اوپر اتارتے ہیں، اہل دہلی کو
ظالمین مشرکین سے ملاتے ہیں، اور اپنے تئیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عیاذاً باللہ دوسرے صاحب
میذنہ کے پاس بھی اسی طور پر حنفیہ کا خاکہ اڑا رہے تھے، لیکن کف لسان کے ساتھ، تیسرے صاحب دوسری
جانب میذنہ کے محدثین و متبعین سب کی خبر لے رہے تھے، الحنا و قیام تعظیمی کے منع کرنے پر سخت سست
کہہ رہے تھے، چوتھے صاحب حوض پر کچھ مناجاتیں اور نعتیہ غزلیں پڑھ کر لوگوں کو اپنی طرف راغب
کر رہے تھے، الغرض ایک ہڑبونگ تھا، اس ہڑ دنگے پن کو دیکھ کر نہایت افسوس ہوا، خدا کی مرضی

میں کسی کو دخل نہیں، جب سلطنتِ اسلام جاتی رہی تو جسکا جو جی چاہے کیے، اور کرے،

مدرسہ حسین بخش میں وعظ

وہان کی یہ حالت دیکھ کر منشی حسین بخش کے مدرسہ آیا، یہان نماز ہو چکی تھی، اور وعظ کی تیاریان ہو رہی تھیں، لوگوں کا بہت بڑا ہجوم تھا، جامع مسجد سے بھی لوگ صرف وعظ کے سننے کو یہاں آئے تھے، مولوی کرامت اللہ صاحب یہاں وعظ کہتے ہیں، ان کے وعظ میں فقیر کو بہت دلبستگی ہوئی، اول سے آخر تک بیٹھا رہا، یہ بزرگ صوفی مشرب معلوم ہوتے ہیں، عصر کی نماز پڑھکر چاندنی چوک ہوتا ہوا مغرب تک قیام گاہ پر واپس آیا،

پرانی دلی

روز شنبہ ۲۰ رجب آج صبح کو اٹھکر قطب صاحب کی سیر کا ارادہ ہوا، اس وجہ سے کھانا جلد پکوا کر کھالیا، یہاں سے وہاں تک ایک روپیہ میں یکہ ہوا، یہ خاکسار اور برادر صاحب مکرمی سید خلیل الدین اور عزیزی محمد صالح سوار ہو کر چلے، دہلی دروازہ سے باہر نکل کر جیلخانہ اور کوٹلہ کے درمیان سے سڑک گئی ہے، یہیں سے آثار مندرسہ مساجد و مزارات و قلعجات و محلات کے شروع ہوئے، جن کے کھنڈرون پر کائی جمی ہوئی ہے، کوئی رہنے والا نہیں، ٹوٹی پھوٹی عمارتیں پڑی ہیں، کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ان عمارتوں کو کس کس نے بنایا تھا، ہزارون عمارتین ہین جن کے آثار بھی باقی نہیں ہیں، مساجد و مشاہد کے آثار اسوجہ سے باقی رہگئے، کہ وقف ہونے کی وجہ سے وہ توڑی نہیں گیئن، تاہم کتنی مساجد و مشاہد ہیں، جو نیست و نابود ہو گئی ہیں، کتنے قلعہ ہیں جو سر بفلک کشیدہ ہین، لیکن تغیرات زمانہ سے شکست ہو گئے ہین، کچھ دنوں میں ان کا نام و نشان بھی نہ رہے گا، چار میل پر جاکر اسی قسم کے آثار و نشانات زیادہ پائے گئے، معلوم ہوتا تھا، کہ ایک شہر ویران و خراب پڑا ہوا ہے جس کے مکانوں کی چھتیں گر گئی ہیں، دیوارین ٹوٹ گئی ہیں، کچھ کھڑی ہیں کچھ پڑی، اسی میں حضرت نظام الدین اولیاء کا مقبرہ ہے جسکو یہان کے عرف میں سلطان جی اور نظام الدین کہتے ہین، پھاٹک کے اندر ایک باولی بھی بہت بڑی ہے، وہ اسی وقت کی بتائی جاتی ہے، اسکی دیوار بہت اونچی ہے، اس کے کنارہ کنارہ ہو کر اندر گئے،

بیچ صحن میں قبہ تھا، اس کے اندر مزار مبارک ہے، اس کے گرد سنگ مرمر کا کٹہرہ ہے، جس کو شمس الامرا امیر کبیر خورشید جاہ بہادر نے نذر گزرانا ہے، سرہانے بلندی پر ایک کلام مجید بخط نسخ جلی حروف بہت صحیح رکھا ہے، تمام صحن میں سنگ مرمر کا فرش ہے، وہان سے آگے بڑھ کر دو مقبرے سنگ مرمر کے ہیں ان پر قبہ نہیں ہے، ان کے کواڑے بھی سنگ مرمر کے ہیں، ان کا کام قابل دید ہے، داہنے طرف والا محمد شاہ کا ہے، دوسرا بائیں طرف مرزا ابو ظفر کے [۱] .... کا ان دونوں کی ساخت اعلیٰ درجہ کی ہے وہاں سے آگے بڑھ کر امیر خسرو دہلوی کا مقبرہ ہے، ان کے مزار کے گرد بھی سنگ مرمر کا کٹہرہ شمس الامرا کا بنوایا ہوا ہے، ان مزارون پر فاتحہ پڑھکر مسجد دیکھنے کو آئے، اس کے قریب ایک اور سنگ مرمر کا مقبرہ ہے، اس میں تین قبریں ہیں، ایک نواب جہان آرا بیگم کی ہے، اس کے لوح مزار پر یہ شعر کندہ ہے:۔

بغیر سبزہ نہ پوشد کسے مزار مرا   که قبر پوش غریبان ہمیں گیاہ بس است

اس کے تلے لکھا ہے، "الفقیرۃ الفانیہ جہان آرا بیگم مرید خواجگان چشت بنت شاہجہان بادشاہ" مسجد علاء الدین غوری کی بنوائی ہوئی ہے، سنگ سرخ کی، اسکی بلندی و وسعت قبہ و سنگ تراشی کا کام قابل دید ہے، دیکھکر آدمی متحیر ہو جاتا ہے، اس کو دیکھکر باہر نکلے، ان مقبروں میں مزارات اور بھی کثرت کے ساتھ ہیں، مجاورین یہاں کے نہایت سلیقہ کے ہیں، ہمارے جانے سے کچھ غل شور نہین ہوا، سب بجائے خود بیٹھے رہے، کسی نے سوال بھی نہیں کیا، جو دیا وہ لے لیا،

قطب صاحب

وہاں سے نکل کر قطب صاحب گئے، قطب صاحب شاہجہان آباد سے گیارہ میل ہے، اس مسافت میں کئی قلعے راستہ میں ملے، دہلی کی پرانی آبادی یہان کثرت سے ہے، شہر آباد ہے لیکن نہایت بے رونق، جہان تک نگاہ جاتی ہے، سوا ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہیں آتا، ہر چند کہ آبادی کے شروع میں قطب صاحب کی لاٹ ملتی ہے، لیکن ہم سیدھے حضرت

[۱] اصل مسودہ میں یہ لفظ چھوٹا ہوا ہے،

قطب الدین بختیار کاکی کے مزار پر گئے، راستہ ہی سے مجاورین نے یکہ کیساتھ دوڑنا شروع کیا، شہر میں پہونچکر اور بھی جمع ہوگئے، مزار کے پاس پہونچکر انبوہ ہوگیا، سائلوں نے دست درازی شروع کی، اس مقبرہ میں چار دیواری کی عمارت بھی سنگ مرمر کی ہے، قبہ نہیں ہے، اس کے گرد و پیش صدہا قبریں ہیں، وہاں فاتحہ پڑھکر نکلے، مسجد وغیرہ دیکھیں، سائلوں کا انبوہ ساتھ تھا، جو کچھ ہو سکا ڈانکو دیکر بہ مشکل عقب گذاری کی، وہاں سے بہادر شاہ خاتم السلاطین کے مسرت محل کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے، باہر آئے، باہر ایک مسجد میں ظہر کی نماز پڑھی، بھائجی وہاں ٹھہر گئے، میں اٹھا مسجد دیکھنے کو بازار ہوتا ہوا شہر سے باہر نکلا، جھریا پردہ مسجد ہے، جہاں پھول والوں کی سیر ہوتی ہے، مسجد کے گرد و پیش مزار ہیں، مسجد بلا محراب و سقف و ستون کے ایک بلند مقام پر ہے، نیچے اوس کے جھیل ہے، اور اس پر سایہ دار درخت ہیں، گرد مرتفع چبوترہ ہے، اس کے نیچے حوض میں مسجد ہے، یہ مقام نہایت ہی دلکشا و فرحت بخش مہبط انوار الٰہی ہے، وہان جانے سے طبیعت منشرح ہوتی ہے ایک معمر آدمی وہاں ایک کوٹھری میں بیٹھا ہوا تھا، اس سے معلوم ہوا، کہ اس مسجد میں حضرت معین الدین چشتی خواجہ بزرگ اور حضرت قطب الدین بختیار کاکی تشریف رکھتے تھے، اور اولیا، کبار اوس وقت جمع ہوتے تھے، واقعی یہ عجیب جگہ ہے، جیسی دلچسپی مجھ کو یہاں ہوئی اس وقت تک کسی مقام میں نہیں ہوئی، اس پیر مرد سے میں نے شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے مقبرہ کو پوچھا، اس نے وہیں سے بیٹھے بیٹھے ایسا پتہ دیا کہ باوجود کوشش کے میں وہان تک نہ پہنچ سکا، بلا مبالغہ میں نے اس وقت اپنی پوری ہمت سے کام لیا، اور کم سے کم اس جھیل کے گرد و پیش کھنڈروں کو روندتا مزاروں کو پھاندتا اتنا چلا، کہ کوس بھر سے زیادہ مسافت پڑگئی، اور میں تھک گیا، پھر کوئی آدمی بھی نہ ملا جس سے نشان پوچھتا، اولیا مسجد سے اتنا دور نکل گیا، کہ پھر لوٹنے کی ہمت نہ ہوئی حالانکہ بعد کو معلوم ہوا کہ اولیا مسجد کے پاس ان کا مزار تھا، وہاں سے آنکھ پھاڑ کر جدھر میں دیکھتا تھا

سوا کھنڈروں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا، مجبور ہوکر وہان سے بازار ہوتا ہوا اس جگہ پر واپس آیا، جہان بھائجی اور مجد کو چھوڑ گیا تھا، پھر ہم سب یکہ پر سوار ہوے، اور واپس چلے،

قطب مینار

قطب صاحب کی لاٹ پر پہونچکر پھر اترے، اسکی عمارت قابل دید ہے، یہ مسجد کا ایک مینار ہے، جو پرتھی راج کے بتخانہ کو توڑ کر بنوایا جاتا تھا، اس کے بتخانہ کے نشانات بھی مسجد کے زینہ میں اب تک موجود ہیں، ایک مینار صرف بنا تھا، دوسری میں لگا لگا تھا، کچھ محرابیں بن چکی تھیں، کہ داعی اجل نے بانی کو پکارا، اور وہ جان بحق تسلیم ہوا، مجھ کو یاد پڑتا ہے، اس مسجد کی شمس الدین التمش نے بنیاد ڈالی تھی، اگر بنجاتی تو تمام عالم میں بے مثل عمارت ہوتی، مسجد ایا صوفیہ کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہ ہوتی، ولید بن عبد الملک کی مسجد کو جو دمشق میں ہے لوگ بھول جاتے، اس وقت اس کے صرف ایک مینار کو دیکھنے یورپ سے لوگ آتے ہیں، باوجودیکہ دو کھنڈ اس کی اتار لی گئی ہیں، لیکن اب بھی اتنا مرتفع ہے، کہ اس کے برابر اور کوئی مینار مرتفع نہ ہوگا، تین سو سے زائد زینے ہیں، ان سب باتوں سے قطع نظر کرکے سنگ تراشی کا کام دیکھئے تو عقل حیران ہوتی ہے، آذر ہوتا تو وہ بھی دیکھکر مبہوت ہوجاتا، میں نے سانچی کا ناکھیڑہ کی عمارتیں دیکھی ہیں، جو حضرت عیسٰی علیہ السلام سے تقریبًا چھ سو برس پیشتر کی عمارتیں ہیں، اور سنگ کو موم کردیا ہے، لیکن میرے نزدیک اس کے سامنے اسکی کوئی حقیقت نہیں، اہرام مصری کا نام ہی نام ہے، وہ انگھڑ بے جوڑ عمارت اسکی برابری کیا کرسکتی ہے، سیاحوں نے مان لیا ہے کہ یہ عمارت لاثانی ہے، اس کے داہنے طرف ایک بہت مرتفع دروازہ ہے، اس کے اندر ایک وسیع گنبد ہے، جس کا کام تعبیہ مینار کا سا ہے، اسکو دیکھکر بھی حیرت ہوتی ہے، اس کو علاء الدین غوری کا بتاتے ہیں، مگر مجھکو اس میں تامل ہے، اس مقام پر تاریخ فرشتہ دیکھنی چاہیئے، یا آثار الصنادید مصنفہ ڈاکٹر سید احمد خان بہادر، ناظرین یہ عمارتیں ایسی نہیں ہیں، جن کے پورے پورے حالات کوئی بیان کرسکے، اور کوئی شاید بیان کرسکے، لیکن میں معترف ہوں کہ ایک شمہ بھی ان کے واقعی حالات

کا مجھ سے نہیں بیان ہوسکتا، اور وہ شخص کیا بیان کرسکتا ہے، جس نے ان کو آنکھ بھر کر بھی نہ دیکھا ہو، جس نے ایسی آنکھ سے دیکھا ہو جس میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے ہوں، کوئی یورپین یا ہندو جنٹلمین ان کو تماشا گاہ سمجھتا ہو تو ہو لیکن میں کیا تمام مسلمان ان کو مرقعِ عبرت یا افسانہ حسرت خیال کرتے ہیں، مسلمانوں کو اس سے زیادہ کیا حسرت کا مقام ہوگا، کہ وہ ان اقبال مندیوں کے مقابلہ اپنی حالت کو حقیقی ادبار میں پاتا ہے، سچ ہے، ملک و دولت میں کسی کا اجارہ نہیں "یُورِثُھَا مَنْ یَّشَاءُ" ع

اوست سلطاں ہرچہ خواہد او کند،

منصور علی خان کا مقبرہ

وہاں سے پھر سوار ہوکر کارخانہ قدرت کی نیرنگیوں کو چپ و راست چشم حسرت سے دیکھتا ہوا پھر چلا، تقریباً چھ میل نکل کر منصور علی خان کا مقبرہ ملا، یہ نہایت عالیشان مقبرہ ہے، اس کا رمنہ بہت وسیع ہے، اور اندر وسط میں مقبرہ ہے، پھاٹک کے قریب سنگ سُرخ کی مسجد ہے، مقبرہ بھی سنگِ سُرخ کا ہے، سنگ مرمر کی گوٹ اور تحریریں قابلِ دید ہیں، سنگ تراشی اور لداؤ کا کام نظارہ سے متعلق ہے، ایک عمارت ہو تو اس کی تعریف کی جائے، ایک کو دیکھ کر ایسی حیرت ہوتی ہے، کہ دوسری بھول جاتی ہے،

میں باوجودیکہ دو ہفتہ برابر کوشش کرتا رہا، تاہم بہت سی عمارتیں دیکھنے کو چھوٹ گئیں، سید حسن رسول نما کا مزار اجمیری دروازہ سے باہر بہار گنج کے آگے پنج کنولوں میں ہے، باوجود آرزو کے وہ بھی نہیں دیکھ سکا حضرت نصیر الدین روشن چراغ دہلی کا مزار سلطانجی سے کچھ فاصلہ پر راستہ سے دور بڑی دشوار گذار جگہ میں ہے، کہ یکہ آسانی سے نہیں جاسکتا، اسی کے قریب کچھ ہٹ کر حضرت سید نور محمد بدایونی کا مزار ہے، ان مزاروں پر بھی نہیں جاسکا، شیخ عبدالحق دہلوی کے مزار تک بھی نہیں پہونچ سکا حضرت شیخ محمد عابد سنامی کا مزار قدم شریف سے کچھ آگے ہے، لیکن اب وہ بالکل مٹ گیا ہے وہاں بھی جانا نہیں ہوسکا، ان مزاروں کے سوا اور مزاروں کی گنتی نہیں ہوسکتی، اس خاک پاک سے ایسے

ایسے برگزیدہ لوگ نکلے ہیں، اور اسی خاک پاک میں مدفون ہیں جن کا شمار نہیں ہوسکتا،

ماتم

اے دلی اب ہم تجھ سے رخصت ہوتے ہیں، اے مرقعِ عبرت، اے تازیانۂ غیرت، اے افسانۂ حسرت، اے آئینۂ حیرت اے مسلمانوں کی گذشتہ اقبالمندیوں کے نمونے، اے لق و دق صحرا، اے مسلمانوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندے ہوئے میدان، اے درحقیقت مسلمانوں کی خاک پاک تیرا وہ پرانا جاہ و جلال کہاں، وہ لوگ کہاں ہیں جو تیری زیب و زینت کے باعث تھے، جو تیرے آسمان کے ستارے تھے، تیرے وہ دلاور کہاں ہیں، جو راجپوت اور راٹھور بہادروں کی صفیں درہم برہم کردیتے تھے، تیرے وہ بزرگانِ دین کہاں ہیں، جن سے روحانیات اور ملائکہ مصافحہ کرتے تھے، وہ اہلِ کمال کہاں ہیں، جن سے استفادہ کرنے کو سارے جہان کے لوگ آتے تھے، ہائے دلی ہائے، مردہ قوم کی یادگار دلی تو وہی ہے، جس میں قطب الدین ایبک کا تہور، شمس الدین التمش کی اولوالعزمی، غیاث الدین بلبن کی تدبیر مسلمانوں کے ظفر و اقبال کا نمونہ تھی، تو وہی دلی ہے، جس کے خلجی و تغلق فرمانرواؤں کی سطوت تمام عالم میں ضرب المثل تھی، تو وہی دلی ہے، جس میں لودی اور افغان بادشاہوں کی حکومت رہ چکی ہے، تو وہی دلی ہے، جس کے لعل و گوہر دربار اکبری کے زیب و زینت تھے، اے خاک پاک دلی تجھ میں سیکڑوں خانقاہیں اور مدرسے تھے، ان بزرگوں کو تو ہی نے اپنے آغوش تربیت میں پالا تھا، جن کی جوتیوں کی خاک ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے، ہائے دہلی یہ تیرا مرثیہ نہیں ہے، قوم کا مرثیہ ہے، اے ہماری شامتِ اعمال کی برباد شدہ دلی کیا پھر ہم تیرا اگلا جاہ و جلال دیکھ سکتے ہیں، ہم میں وہ فاروقی جلادت خالدی جرأت، قومی اتفاق اسلامی جوش انسانی ہمدردی اب کہاں آسکتی ہے،

افسوس کہ گلرخان کفن پوش شدند — وز خاطر یک دگر فراموش شدند

آنانکہ بصد زبان سخن می گفتند — آیا چہ شنیدند کہ خاموش شدند

ان میں تہور تھا ہم میں جبن ہے، ان میں جرأت تھی، ہم میں نامردی ہے، ان میں قومی اتفاق

تھا، ہم میں نفاق، وہ پرجوش تھے، ہم خاموش، ان میں انسانی ہمدردی تھی، ہم میں بیدردی، وہ دین و دنیا کو توام سمجھتے تھے، ہم برہم، وہ غیور تھے ہم بےغیرت، ان میں فخر نہ تھا، ہم میں کبر ہے،

فریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا　　خدا کی یاد بھولا شیخ بت سے برہمن بگڑا

اے ناظرین کیا ایسی قوم جو متصف بصفاتِ بالا ہو، کبھی گر سکتی ہے، اور کیا ایسی قوم جس میں یہ نقائص ہوں، کبھی ابھر سکتی ہے، کیا مردہ بدن میں روح اعادہ کر سکتی ہے، کیوں نہیں کہتے نہیں جب تک ہم بھی دین و دنیا کو تُوام نہ سمجھیں، دنیاوی کاموں کے ساتھ دینی اغراض متعلق نہ کریں نہیں کر سکتی، ہاں ہاں کر سکتی ہے، اے اللہ، اے منشی و معید تجھ میں سب قدرت ہے، تونے عزیر علیہ السلام کی ویران قیامگاہ کو از سرِ نو سرسبز کر دیا، تونے عزیرؑ کے مردہ بدن میں روح پھونکی، تونے حمار کے عظام رمیم پر اکساء لحم کیا، تونے اصحابِ کہف کے صدہا سال کے مردہ بدنوں میں روح اعادہ فرمائی، تونے طیور اربعہ کو متفرق الاجزا ہو جانے پر زندہ کر کے اپنی قدرت کا تماشا دکھایا، تونے مسیح کو بے باپ کے پیدا کیا، تونے مسیح کو یہ قدرت دی کہ وہ تیرا نام لیکر مردہ کو زندہ کر دیتے تھے، تونے عرب کی مردہ اور جاہل قوموں کو دین ابراہیمی ملت حنیفیہ سے ہٹ جانے والے لوگوں کو ہمارے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے انفاسِ مسیح سے زندہ کر کے تمام عالم سے زیادہ مہذب کر دیا، تو اس جہان فانی کو یکسر نابود کر کے پھر پیدا کرے گا، اولم یر الانسان انا خلقناہ من نطفۃ فاذا ھو خصیم مبین و ضرب لنا مثلا و نسی خلقہ قال من یحیی العظام و ھی رمیم قل یحییھا الذی انشاھا اول مرۃ و ھو بکل خلق علیم ہ اولیس الذی خلق السموٰت و الارض بقادر علی ان یخلق مثلھم بلی و ھو الخلاق العلیم انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ کن فیکون فسبحان الذی بیدہ ملکوت کل شئ و الیہ ترجعون، اے اللہ اے ارحم الراحمین تو اس مردہ قوم کو از سرِ نو زندہ کر، ان کے دلوں میں اسلامی جوش، قومی اتفاق، انسانی ہمدردی کی ان کے بازوں میں قوت، ان کے اخلاق میں صلاحیت عطا فرما، پھر تیرے نام پر اپنی جانیں فدا کریں، اور باہم اعدا یکدگر ہونے کے عوض میں اعضائے یکدگر بنجائیں، آمین آمین یا مجیب السائلین،

(باقی)

بابر کی موت

از

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے رفیق دار المصنفین

بابر کی موت کی تفصیل ابو الفضل نے اکبر نامہ میں یہ لکھی ہے:۔

"وآن حضرت جہانبانی را (یعنی ہمایوں کو) بعد از چندگاہ (کہ در ملازمت بودند) بہ سنبل (کہ بجاے گیر ایشان مقرر بود) رخصت فرمودند، و تا شش ماہ در سنبل کامیاب عیش و عشرت بودند تا آنکہ عارضۂ تپ بر مزاج اعتدال امتزاج ایشان طاری شد و رفتہ رفتہ بامتداد کشید حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی ازیں خبر جانکاہ بےقرار شدہ از فرط عطوفت فرمودند کہ بہ دلی آرند، و از آنجا بکشتی روانہ سازند تا در حضور طبیبان حاذق معالجہ نمایند و جمعے کثیر از اطباے دانا (کہ در پاے تخت حاضر بودند) باستصواب افکار در علاج ہمت گماشتند، در اندک فرصتے براہ دریا قدوم گرامی ارزانی داشتند، ہر چند تدبیر و معالجات بکار بردند و تدبیرات صحیح نمودند، مزاج از انحراف بصحت رجوع نہ کرد،

"چوں مرض مزمن گشت، روزے دران طرف آبِ جون نشستہ باتفاق دانایان عصر اندیشۂ معالجہ می فرمودند، میر ابو البقار کہ از اعاظم افاضل آن روزگار بود بعرض رسانید کہ از خرد پروران پیشیں چنان رسیدہ کہ در امثال ایں امور (کہ اطباے صوری از معالجہ آن عاجز آیند) چارہ کار چنیں دیدہ اند کہ بہتریں اشیا را تصدق نمودہ صحت از درگاہ الٰہی مسئلت نمایند حضرت

گیتی ستانی فرمودند کہ بہترین چیز ہا نزدیک ہمایوں منم وبہترین وشریف تر از من ہمایوں
چیزے ندارد، من خودرا فدای اومی سازم، ایزد جہان آفرین قبول کناد، خواجہ خلیفہ ودیگر
مقربان بساط والا بعرض اشرف رسانیدند کہ ایشاں بعنایت الٰہی صحت عاجل خواہند یافت
ودر سایۂ دولت آن حضرت بعمر طبیعی خواہند پیوست، ایں حرف چرا بر زبان اقدس می گزرانند
مقصود از انچہ از بزرگان پیشین نقل افتادہ آنست کہ بہترین مال دنیا تصدق نمایند، پس ہماں
الماس بے بہا (کہ از مواہب غیبی در جنگ ابراہیم بدست افتادہ بود وآن را بایشاں عنایت
فرمودہ اند) تصدق باید کرد، فرمودند، مال دنیا چہ وقع دارد، وعوض ہمایوں چوں تواند شد
خودرا فدائے او می کنم، کہ کار بر وسخت شدہ، وطاقت از آن گذشتہ کہ بے طاقتی او را توانم
دید، وایں ہمہ رنج او را توانم تاب آورد، آن گاہ بخلوت مناجات درآمدہ شغل خاصے (کہ ایں
طبقہ قدسیہ رامی باشد) بجائے آوردہ سہ بار برگرد حضرت جہانبانی جنت آشیانی گشتند
چون دعوت ایشان بعز اجابت پیوستہ بود، اثر گرانی در خود یافتہ فرمودند، برداشتیم، برداشتیم
فی الفور حرارت غریبہ عارض بدن آنحضرت شد، ودر عنصر حضرت جہانبانی خفتے طاری گشت
چنانچہ در اندک فرصتے صحت کامل روی نمود، وذات معلی صفات حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی زمان
زمان گراں تر می شد تا بہ حدے رسید، کہ اختلال در مزاج تزاید وتضاعف گرفت، وامارات
رحلت وانتقال از وجنات حال ہویدا گشت، تا آن کہ با دل بیدار وباطن حقیقت بین ارکان
دولت واعیان مملکت را احضار فرمودہ دست بیعت خلافت را بر دست ہمایونی نہادہ
بجانشینی وولی عہدی خود نصب فرمودند، وبر تخت خلافت جلوس دادہ خود در پایہ سریر خلافت
مصیر صاحب فراش گشتند.................

.... وبتاریخ ششم جمادی الاول سنہ ۹۳۷ نہصد وسی وہفت در چہار باغ

(کہ بر لب آب جون در دار الخلافہ آگرہ سرسبز کردۂ آن ہمہ اقبال بود) ایں عالم بے وفا
را بدرود کردند........[1]

مذکورۂ بالا روایت کو ایشیاٹک سوسائٹی جرنل اور کلکتہ ریویو کے ایک مقالہ نگار نے ابوالفضل کا
محض ذہنی اختراع قرار دیا ہے، چنانچہ اس کو جھوٹ ثابت کرنے کے لئے اوس نے جو دلیلیں قائم کی ہیں،
وہ بھی ملاحظہ ہوں،

"ہمایوں نومبر سنہ ۱۵۲۹ء میں کالنجر بھیجدیا گیا، جہاں وہ چھ مہینے رہا، اس کے فوراً ہی بعد شاید
اپریل سنہ ۱۵۳۰ء میں وہ بیمار پڑا، جب اس کی علالت تشویشناک ہوگئی، تو وہ دریا کی راہ سے
آگرہ لایا گیا، یہاں اطبار نے ہر طرح کا علاج کیا، لیکن بے سود ثابت ہوا، ہمایوں کی حالت
نازک ہوگئی، تو بابر گھبرایا، شہزادہ کی صحت کے لئے دوا کے علاوہ اور بھی تدبیریں سوچی
گئیں، میر ابو البقا نے جو اس عہد کے برگزیدہ ولی تھے، ہمایون کے نام سے ایک قیمتی
چیز صدقہ کرنے کا مشورہ دیا، کہ شاید قسمت سے ہمایوں شفا پا جائے، کسی نے ڈرتے
ڈرتے کوہ نور جسکی قیمت دنیا کے نصف روزانہ اخراجات کے برابر تھی، خدا کی راہ میں دینے
کے لئے کہا، لیکن بابر کی رومان پسند طبیعت نے اس کو پسند نہیں کیا، اس نے اس چیز کو قربان
کرنا چاہا، جو اس کو سب سے زیادہ محبوب تھی یعنی اپنی جان کو، اس نے سوچا کہ جان کے عوض
میں جان ہی دے کر ہمایوں کو موت کے پنجے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے، بعض درباریوں
نے بیٹے کے ساتھ اتنی شدید محبت اور شفقت کا اظہار کرنے سے روکنا چاہا، بابر ابھی کل
۴۸ سال کا تھا، اس نے ہندوستان میں صرف چار سال تک بادشاہت کی تھی، مغلوں
کی حکومت گو وسیع ہوگئی تھی، لیکن ابھی مستحکم نہیں ہونے پائی تھی، اس کی موت سے مغلوں
کے لئے مختلف مسائل کے پیدا ہو جانے کا خطرہ تھا، ہمایوں بابر کا کوئی اکلوتا لڑکا نہ تھا،

[1] ص ۱۱۶-۱۱۷-۱۱۸)

اس کے کئی لڑکے تھے جو ہمایون کی طرح اس کے جانشین ہو سکتے تھے، اس کے علاوہ کیا بابر کو امید تھی کہ اسکی دعا واقعی قبول ہو جائے گی؟ یہ تو ایک معجزہ کے ظہور ہونے کی امید کرنا تھا، گو دعا مانگنے کے معنی معجزے کا ظہور ہی ہوتا ہے، لیکن بابر میں کوئی معجزے کی قوت تو تھی نہیں، اس سے قبل وہ کنواہا کی جنگ کے موقع پر اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے تائید الٰہی کا خواہاں ہوا تھا، لیکن ہمایوں کے لئے جان دینا تو محض اسکی رومان پسند فطرت کا اقتضا تھا، اپنی ایک علالت کے موقع پر بھی اس نے قسم کھالی تھی، کہ شعر و شاعری کی آلودگیوں کو ترک کر دیگا، اور اس کے بدلے مذہبی رموز و نکات میں اپنے کو مشغول رکھے گا، ممکن ہے کہ بابر کو یقین ہو، کہ ایک باپ کی شدید محبت کے اظہار سے خدا اس کے لڑکے کی جان بچالے گا، یا ممکن ہے، کہ ہمایون کی زندگی سے مایوس ہو کر اس نے محبت میں ایسا کر لیا ہو، لیکن یہ کہنا مشکل ہے، کہ اس کو سچ مچ یقین تھا، کہ قسام ازل اس کی بات کو منظور کر ہی لیگا، اور وہ محض ہمایوں کی خاطر قبل از وقت مر گیا، گلبدن بیگم کے بیان سے تو یہ مشکوک ہے کہ بابر کو واقعی اس قسم کا کوئی یقین پیدا ہو گیا تھا،

بابر نے محض جذبات سے متاثر ہو کر بیٹے کی محبت مین اتنا رومانی طریقہ اختیار کیا، ایک دن قبل وہ علیؓ سے ہمایوں کی جان بخشی کا خواہاں ہوا تھا، اور اب وہ ہمایوں کے گرد گھوما، اور دعا کی، کہ "اے خدا! اگر جان کی عوض میں جان بدلی جاسکتی ہے، تو میں (بابر) اپنی زندگی اور عمر کے بقیہ سال ہمایوں کو دیتا ہون"۔

یہ کہنے کے بعد بابر فوراً ہی نہیں، بلکہ "اس روز کے کسی وقت میں" ہمایوں اس لائق ہو گیا، کہ غسل صحت کرے، اور زنانخانے سے باہر آجائے، لیکن بابر کی مسلسل دعا، او جذباتی ہیجان جو اس پر گذرا، اس کے لئے سخت ثابت ہوا، وہ علیل ہو گیا، اور اسی

حرم کے اندر لیجایا گیا،

بابر کی یہ علالت سخت نہیں رہی، وہ جلد اچھا گیا، اور کام بھی کرنے لگا، اسکی علالت سے اتنی کم تشویش باقی رہ گئی، کہ ہمایوں سنبل چلا گیا،

لیکن ہمایوں جب سنبل میں تھا، تو بابر جولائی ۱۵۳۰ء میں پھر علیل ہو گیا، اس کا مرض بڑھا تو بھی ہمایوں کو اس کی علالت سے بے خبر رکھا گیا، امیر نظام الدین خلیفہ ہمایوں کی جانشینی نہیں چاہتا تھا، .... اسلئے موقع پاکر مہدی خواجہ کو بادشاہ بنادیا، ......

ہمایوں جلد از جلد سنبل سے آگرہ پہنچا، باپ کی حالت دیکھ کر بہت متعجب ہوا، اور چلایا "میں نے تو ان کو اچھا چھوڑا تھا، پھر یکایک یہ کیا ہوا" اس کے بعد بابر کچھ اچھا ہو گیا، چنانچہ اس نے دو شہزادیوں کی شادی کرنے کا حکم دیا، لیکن بابر کی علالت پھر تشویشناک ہو گئی، ہمایوں نے ایک طبی مجلس منعقد کی اور باپ کی بڑھتی ہوئی تکلیف کو دور کرنا چاہا، مشورے ہوتے رہے، آخر میں اطبار نے یہ کہا کہ بابر کا مرض اس زہر کا نتیجہ ہے، جو چند سال قبل ابراہیم لودی کی ماں نے اس کو دیا تھا، چنانچہ طبیبوں نے اس مرض کے علاج سے اپنی مجبوری ظاہر کی، بابر نے ہمایوں کو اپنا جانشین مقرر کیا، اور تین دن بعد بروز دوشنبہ تاریخ ۲۵ دسمبر ۱۵۳۰ء کو انتقال کر گیا، ....

مندرجۂ بالا واقعات کی سادہ تفصیل سے یہ بات کہیں سے ظاہر نہیں ہوتی ہے، کہ ہمایون کے بستر علالت کے قریب کوئی معجزہ ظاہر ہوا، بابر کو یہ امید بالکل نہیں تھی، کہ اسکی دعا مقبول ہو گی، گلبدن نے تو محض اسکو مشروط لکھا ہے، گرچہ بابر اسی روز علیل ہوا، اور محل کے اندر لیجایا گیا، لیکن وہ پھر بہت جلد اچھا ہو گیا، اگر بابر علیل رہتا تو ہمایوں آگرہ چھوڑ کر سنبل نہ جاتا ہی نہیں، بلکہ ہمایوں جب آگرہ واپس آیا، تو اس نے شکایت کی، کہ اسکی غیر موجودگی

میں بابر پھر کیسے علیل ہوا، گلبدن بیگم کے بیان سے ظاہر ہے، کہ ہمایوں کی واپسی کے بعد بابر
ایک ہفتہ سے زیادہ زندہ نہیں رہا، پھر امیر خلیفہ ایک دوسرے شخص کی تخت نشینی کے لئے کوشاں
تھا، تو یہ بات قابلِ قبول نہیں معلوم ہوتی ہے، کہ ہمایوں کی ماں اس کو بابر کی علالت
سے بے خبر رکھتی خصوصاً جب یہ نازک ہو رہی تھی، لہذا یہ ظاہر ہے کہ اس کی علالت ہمایوں
کی آمد سے صرف دس روز قبل تشویشناک ہوئی، اور اس کی سخت علالت دسمبر کے دوسرے
ہفتہ سے شروع ہوئی، یہ بات تاریخ خاندان تیموریہ[1] سے بھی پایۂ ثبوت کو پہونچتی ہے جس
میں بابر کی علالت کی تاریخ رجب لکھی ہوئی (رجب میں تو بابر کے مرے دو مہینے ہو چکے
تھے، رجب غلطی سے ربیع الثانی کے بجائے لکھ گیا ہے،) چنانچہ اس لحاظ سے بابر کی سخت علالت
کی تاریخ یا تو نومبر کا آخر یا دسمبر کا آغاز ہے،

احمد یادگار کی تاریخ سے واضح ہے، کہ بابر کی علالت ہمایوں کی صحت یابی کے
فوراً ہی بعد نہیں، بلکہ ہمایوں کے سنبل جانے کے دو تین مہینے کے بعد شروع ہوئی گلبدن
بیگم کا بیان ہے، کہ بابر دو تین مہینے تک بیمار رہا، تو اس لحاظ سے وہ اکتوبر سنہ ۱۵۳۰ء
میں علیل ہوا،

پھر بابر کے اطبا نے اس کی علالت کا سلسلہ اس کے ایثار اور قربانی سے ظاہر نہیں
کیا، وہ بابر کی طرح اس کی بیماری کو خدا کی خوشنودی اور رضامندی سے تعبیر کر سکتے
تھے، لیکن انھوں نے ہمایوں سے یہ کہا کہ بابر کا مرض زہر کا نتیجہ ہے،

مرزا محمد حیدر، عبد القادر بدایونی نظام الدین احمد اور فرشتہ اس باب میں بالکل خاموش ہیں،
ان کی خاموشی معنی خیز ہے،

[1] شاید تاریخ سلاطین افغانان مراد ہے،

اس لئے ابو الفضل کا بیان کہ بابر نے ہمایوں کی خاطر جان دی محض اس کا ذہنی اختراع
ہے، جسکو یقین کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ....:[1]

فاضل مقالہ نگار نے مذکورۂ بالا نتیجہ دس سال کے غور و فکر کے بعد نکالا ہے، اس کا پہلا مضمون ایشیاٹک
جرنل میں سنہ ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا، اسکو از سر نو ترتیب دے کر اور معلومات میں مزید اضافہ کر کے ستمبر سنہ ۳۶ء کے
کلکتہ ریویو میں شائع کیا ہے، سوال یہ ہے کہ بابر محض فطری موت مرا، یا اپنی روحانیت کی قوت سے
یا اپنے محبوب بیٹے کی شفقت میں قربان ہو کر مرا تو اس کے واضح اور نہ واضح ہونے سے تیموریوں
کی تاریخ کے واقعات کی ترتیب میں کون سی کمی یا زیادتی ہو گئی، یا ان کی تہذیب اور معاشرت میں
کس چیز کا اضافہ یا فقدان ہو گیا، جس کے لئے تحقیق و تدقیق میں عمر کی ایک کافی مدت خرچ کی جائے،
البتہ ایک باپ بیٹے کے قلبی تعلقات کے پرکیف جذبہ میں انتشار پیدا کرنا مقصود ہو تو پھر ہر قسم کی ذہنی
کاوش جائز ہو سکتی ہے،

مضمون ہذا کے پہلے حصہ میں مضمون نگار کو بابر کی علالت اور موت کے واقعات کی ترتیب
میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، اسی لئے کچھ ژولیدہ بیانی آگئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف
کی معلومات کا ماخذ گلبدن بیگم کا ہمایوں نامہ ہے، لیکن اس میں کچھ تفصیلات ایسی ہیں، جن کے
اقرار یا انکار سے اس کے مقصد کی کوئی تکمیل نہیں ہوتی ہے، پھر بھی وہ اپنی مسرت کا اظہار کرتا
ہے کہ اسی ہمایوں نامہ کے ذریعہ سے بابر کی موت کی مشہور روایت کی تکذیب ہو جاتی ہے، اب ہمایوں
نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"دریں اثنا عرضہ داشت مولانا محمد فرغولی از دہلی آمد، نوشتہ بود کہ ہمایوں میرزا بیمار اند
وحالی عجبی دارند بشنیدن این خبر حضرت بیگم زود زود متوجہ دہلی می باید شوند کہ میرزا بسیار

[1] کلکتہ ریویو ستمبر سنہ ۱۹۳۶ء

بے طاقتی می کند، بمجرد شنیدن ایں خبر حضرت آکام بے طاقتی کردہ، مانند تشنہ کہ مہجور آب باشد بجانب دہلی متوجہ شدند، در متھرا رسیدند، چنانچہ شنیدہ بودند ازاں دہ چند مضعوف و مجہول بچشم جہاں بیں خویش دیدند، وازآنجا ہر دو۔ مادر و پسر۔ مانند عیسیٰ و مریم متوجہ آگرہ شدند.........

وقتی کہ ایشاں بیمار بودند حضرت روندہ حضرت مرتضی علی کرم اللہ وجہہ نگاہ داشتند وآں روندہ از روز چہار شنبہ نگاہ می دارند، ایشان از اضطراب و بے طاقتی از روز سہ شنبہ نگاہ داشتند، ہوا بغایت گرم بود، دل وجگر ایشان تفید، ودر روندہ مذکور دعا خواستند کہ خدایا اگر بعوض جان جان مبدل شود، من کہ بابرام، عمر وجان خود را بہمایون بخشیدم ودر ہمان روز حضرت فردوس مکانی را تشویش شد وہمایون بادشاہ بر سر خود آب ریختند وبیروں آمدہ بار دادند، وحضرت بادشاہ بابام را ازجہۃ تشویش درون بردند"[1]

ہمایوں نامہ کی اس عبارت اور اکبر نامہ کے بیان میں کچھ معنوی حیثیت سے زیادہ اختلاف نہیں، فاضل مضمون نگار کو بھی اپنے مضمون کی ابتدا میں اس سے انکار نہیں ہے، کہ بابر ہمایوں کی علالت سے متاثر ہو کر اس کے گرد گھوما خدا کی بارگاہ میں گڑگڑایا، اور پھر اسی روز بیمار ہوا، مگر مقالہ نگار نے اپنے مضمون کے آخری حصہ میں ہمایوں نامہ کو چھوڑ کر ایک دوسری تاریخ کا سہارا لیا ہے، اور وہ رقمطراز ہیں، کہ بابر کی علالت ہمایوں کی صحت یابی کے فوراً ہی بعد نہیں بلکہ ہمایوں کے سنبل جانے کے دو تین مہینے کے بعد شروع ہوئی، اس کے لئے ان کا ماخذ احمد یادگار کی تاریخ سلاطین افغانان ہے، اب اسکی عبارت ملاحظہ ہو:۔

"بعد ازان (یعنی رانا سانگا سے لڑائی کے بعد) حضرت گیتی ستانی دو ماہ در نواح دہلی

[1] ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم مرتبہ مسز بیورج ص۲۳،

بسیر وشکار بسر بردہ باگرہ متوجہ شد ومحمد ہمایون شاہزادہ را با لشکر گران در صوبہ سنبل فرستادو ولی عہد کرد وحقیقت آن بود کہ شبے در زمستان حضرت پیالہ نوش جان کردہ بودند، بواسطہ کارے محمد ہمایوں میرزا طلبید، چوں نونہال شاہی بحضور آمد گیتی ستانی چوں مست بودند سر بہ بالین نہادہ در خواب شدند، شاہزادہ ہمچناں دست بستہ ایستادہ ماند، چوں نیم شب از خواب برآمد، ایشان را ایستادہ دیدند، فرمودند کہ تو کے آمدی ایشان عرض داشتند کہ آں وقت کہ حضرت یاد فرمودہ بودند، بادشاہ را یا د آمد بسیار رضامند شدند فرمودند کہ اگر خدائے تعالی ترا تخت وافسر نصیب کند، برادرآن را مکشی، اغماض نظر فرمائی، شاہزادہ سر بر زمین نہاد وقبول نمود..........

الغرض میرزا مذکور با لشکر گران در صوبہ سنبل کہ ماورائے مواس بود فرستادند، بعد دو سہ ماہ حضرت گیتی ستانی را تکسری در بدن ایشاں ظاہر شد دراں باغ کہ بر لب دریا ست بردند، امیر نظام الدین بتداوی ایشاں قیام می نمودہ کاروبار پادشاہی نیز رواں می کردند، چوں تکسر روز بروز زیادت می شد، در دل آورد کہ حالات مرض جنت آشیانی باین نمط رسید فکری باید کرد کہ ایں ملک را صاحبقران ماند وبیگانہ انتقال نماید، چوں بیماری حضرت کشورستانی روز بروز تزاید شد، چنانکہ بتقضائے اللہ سبحانہ در سنہ در آگرہ ازفانی بہ بہشت جاودانی خرامید، ازین گلخن خاروار محنت بسوئی گلزار جنت رخت کشید......

بتاریخ ۵ ذی الحجہ سنہ شاہ کشورستانی از جہاں فانی رفت......"[1]

اس عبارت میں شروع سے آخر تک جو غلط بیانیاں ہیں، وہ ایک حقیقت ہیں مورخ پر ظاہر ہیں، الیٹ نے اس کتاب اور مذکورۂ بالا عبارت پر خصوصاً جو اپنی رائے لکھی ہے، وہ لائق

[1] تاریخ سلاطین افاغنہ قلمی نسخہ بوہار لائبریری، کلکتہ،

توجہ ہے:۔

احمد یادگار کو عجیب و غریب اور مضحکہ خیز قصے لکھنے میں بڑی دلچسپی ہوتی ہے، لیکن وہ تاریخ (سنین) لکھنے میں کم توجہ کرتا ہے، اس نے بہت ہی کم سنین لکھے ہیں، اور ہمایوں کی موت کے مستند واقعہ کے بیان میں تو وہ بالکل غلط ہے[1]"۔

احمد یادگار تیموریوں کے دشمن پٹھانوں کا مورخ ہے، داؤد خان کا درباری مورخ تھا، اس نے اپنی کتاب [illegible] کے بعد یعنی بابر کی وفات کے کم از کم ۶۳ برس بعد لکھی ہے، اب ظاہر ہے کہ احمد یادگار خصوصاً گلبدن بیگم (بابر کی دختر اور ہمایوں کی بہن) کی موجودگی میں زیادہ مستند قرار نہیں دیا جاسکتا ہے،

مقالہ نگار نے گلبدن بیگم کی روایت کو کہیں جھوٹی دکھانے کی کوشش نہیں کی ہے، اس روایت سے اس کو اختلاف اگر ہے، تو یہ کہ بابر نے جو کچھ کیا کرامت دکھانے کی خاطر نہیں کیا، بلکہ محض ہیجانی کیفیت میں ایک رومانی طریقہ اختیار کیا، اور پھر یہ کہ وہ اس روز علیل ضرور ہوا، لیکن پھر اچھا ہوا اور پھر بیمار پڑکر مرگیا،

تو یہ اکبر نامہ کی عبارت سے کب ظاہر ہے کہ بابر سے معجزہ صادر ہوا، بابر کوئی پیغمبر، کوئی ولی یا کوئی خدارسیدہ بزرگ نہ تھا، جو اس سے کرامت یا معجزہ ظاہر ہوتا، بیٹے کی محبت میں سرشار ہو کر اور اس کی تشویشناک علالت سے گھبرا کر اس نے خدائے قدوس کی بارگاہ میں دعائیں کیں اور اپنی محبوب ترین اولاد کے لئے بطور صدقہ بارگاہ ایزدی میں اپنی جان پیش کی، اب اس کو نفسیاتی قوت تاثیر سمجھئے

[1] الیٹ جلد ۵، ص ۲ [illegible] فاضل مضمون نگار کو اس میں شک ہے کہ ہمایوں بابر کا سب سے زیادہ چہیتا لڑکا تھا، اسی لئے وہ کہتا ہے کہ اس کے کئی لڑکے تھے، جو ہمایوں کی طرح اس کے جانشین ہو سکتے تھے، لیکن ہمایوں نامہ کی عبارت ملاحظہ ہو:۔

یا ایک مضطرب دل کی سچی دعا، کہ ادھر منہ سے نکلی، اور ادھر قبول ہوئی، اسی وقت وہ بیمار پڑا، اور ہمایوں اچھا ہونے لگا، یہانتک کہ وہ بالکل تندرست ہو گیا، اور بابر نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، نفسیاتی قوتِ تاثیر جو شدتِ یقین کا نتیجہ ہے، آج مسمرازم اور روحانیت کی تاثیر کی عینی شہادت بن گئی ہے، واقعہ واقعہ ہے، اب مادہ پرستی کے دور میں جس کا جی چاہے، جس تاویل و تشریح سے اپنی تسکین کرلے،

اب رہا یہ سوال کہ بابر اس دعا کے فوراً ہی بعد اس دنیا سے چل بسا یا پھر صحتیاب ہو کر مرا، اکبر نامہ کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں کہ بابر دعا مانگنے کے ساتھ ہی مر گیا، اگر ایسا ہوتا، تو قدرتِ خداوندی کا ایک غیر معمولی مظاہرہ ہوتا، جس کو ہم بابر کی کرامت کہہ سکتے تھے، ابوالفضل کے بیان سے تو صاف واضح ہے، کہ وہ کچھ مدت تک بیمار رہا، لیکن اس کی حالت روز بروز خراب ہوتی گئی، اکبر نامہ کی عبارت پھر ملاحظہ ہو،

"وذات معلیٰ صفات حضرت گیتی ستانی فردوس مکانی زمان گران ترمی شد تا بہ حدے رسید کہ اختلال در مزاج تزاید و تضاعف گرفت، و امارات رحلت و انتقال از وجنات

(بقیہ حاشیہ صفہ) "و چوں حضرت (یعنی بابر) آمدند و دریافتند بمجرد دیدن، آن چہرۂ نور افشان در کلفت درقت شد، و ایشاں بیشتر از بیشتر اظہار بے دلی گرفتند"

دریں اثنا رحضرت اکام گفتند کہ شما از فرزند من غافلید و بادشاہ اید، چہ غم دارید و فرزندان دیگر نیز دارید، مرا غم است کہ فرزند یگانہ دارم، حضرت جواب دادند کہ ما ہم اگرچہ فرزندان دیگر دارم، اما ہیچ فرزندے برابر ہمایون تو دوست نمی دارم، از برائے آن کہ سلطنت و بادشاہی و دنیائے روشن از برائے آن کہ سلطنت نادرۂ دوران کامگار برخوردار فرزند دلبند ہمایون می خواہم — نہ برائے دیگراں"

"حال مو ید اگشت ......"

بابر کی یہ علالت کئی مہینے تک جاری رہی، مگر ہمارے فاضل مضمون نگار نے یہ لکھا ہے، کہ بابر کی یہ علالت سخت نہیں رہی، وہ جلد اچھا ہوگیا، اور کام بھی کرنے لگا، اور اسکی علالت سے آتنی کمزوری باقی رہ گئی، کہ ہمایوں سنبل چلا گیا، لیکن یہ کسی تاریخ سے پتہ نہیں چلتا، کہ بابر اس علالت سے شفایاب ہوگیا، مقالہ نگار نے محض قیاس سے کام لیا ہے کہ اگر بابر کی علالت تشویشناک ہوتی، تو اس کو چھوڑ کر ہمایوں سنبل نہیں جاتا، اور اپنے قیاس کی بنیاد کو اس سے مستحکم بنانے کی کوشش کی ہے، کہ جب ہمایوں بابر کے دم واپسیں کی خبر پاکر آگرہ لوٹا، تو اس کو دیکھ کر چلایا،

"من ایشاں را تندرست گذاشتہ رفتہ بودم، یکبارگی چہ شدہ"[1]

ہمایوں باپ کو چھوڑ کر سنبل ضرور گیا، مگر یہ بالکل بے جا قیاس ہی ہے، کہ بابر اچھا ہوگیا، تو وہ گیا، کیونکہ ہمایوں نامہ میں صاف درج ہے،

"قریب دو سہ ماہ صاحب فراش بودند، و میرزا ہمایوں بجانب کالنجر رفتہ بود"[2]

ہمایوں قریب تین مہینے باپ کے بستر علالت کے پاس رہا، اس سے زیادہ رہنا ملک گیری اور حکمرانی کے سراسر منافی تھا، ایک ایسے ملک میں جو ابھی ابھی فتح ہوا تھا، اور جس کے اطراف و جوانب دشمنوں سے غیر مامون تھے، ایک مدت تک باپ کا بیمار اور بیٹے کا تیماردار رہنا کہاں تک عقل و ہوشمندی کے مطابق ہوتا، چنانچہ بابر نے خود ہمایوں کو کالنجر بھیجدیا، فرشتہ میں ہے،

"تا آن کہ از حیات مایوس شدہ شہزادہ محمد ہمایوں را کہ بہ تسخیر قلعہ کالنجر تعین کردہ بود طلب نمودہ قائم مقام خود گردانید"[3]

ہمایوں بابر کو چھوڑ کر سنبل گیا، تو اس کی حالت بہت زیادہ تشویشناک نہ تھی لیکن واپس آیا، تو اس

۱ ہمایوں نامہ صفحہ ۲۴، ۲ ایضاً، ۳ فرشتہ صفحہ ۲۱۱، نولکشور پریس،

کے شفیق اور محبوب باپ کو سپرد کرنے کے لئے تیار تھے، اضطراب اور بے چینی میں فطری طور پر ایسے موقع پر جو کہنا چاہئے تھا، وہی اس نے کہا،

مضمون نگار کا خیال ہے کہ اس نازک حالت کے بعد بھی بابر اچھا ہوگیا، چنانچہ اس نے اپنی دو لڑکیوں کی شادی خانہ آبادی کے رسوم بھی ادا کئے، مگر گلبدن بیگم کے ہمایوں نامہ کی اصل عبارت یہ ہے:-

"در حین بیماری حکم کردند یا کام کہ گلرنگ و گلچہرہ بیگم را کدخدا باید کرد"[1]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ بابر نے اپنی عین علالت کے زمانہ میں شہزادیوں کی شادی انجام دی، وہ جانتا تھا کہ وہ چند دنوں کا مہمان ہے، اسلئے اپنے لخت ہائے جگر کی تقریب شادی اپنی آنکھوں سے انجام ہوتی ہوئی دیکھ کر شاید مطمئن مرنا چاہتا تھا، ورنہ بستر علالت پر دراز ہو کر لڑکیوں کی شادی کرنے کے کیا معنی تھے؟

مضمون نگار نے ایک سوال یہ پیدا کیا ہے، کہ امیر خلیفہ ہمایوں کے خلاف ایک دوسرے شخص کو تخت بابری کا وارث بنانے کی کوشش کر رہا تھا، تو ہمایوں کی ماں نے اس کو سنبل سے کیوں نہیں بلایا، خصوصاً جب بابر کی حالت نازک ہو رہی تھی، امیر خلیفہ کی سازش باضابطہ عمل میں نہیں آئی، اسکا خیال تھا کہ خواجہ مہدی کو اپنا آلۂ کار بنائے، مگر یہ محض خیال ہی رہا، اور وہ بہت جلد اس سے باز آگیا، اسی اثناء میں بابر کی حالت نازک ہو رہی تھی، چنانچہ (جیسا کہ طبقات اکبری میں لکھا ہے) میر خلیفہ نے خود

"بہ سرعت تمام کس بطلب محمد ہمایوں میرزا فرستاد"[2]

لیکن گلبدن بیگم کے بیان کے مطابق خود بابر نے ہمایوں کو بلا بھیجا،

۱ ہمایوں نامہ ص ۲۴ ۲ تفصیل کے لئے دیکھو طبقات اکبری جلد دوم ص ۲۸، ۲۹، بنگال ایشیاٹک سوسائٹی،

"میرزا ہمایون بجانب کالنجر رفتہ بودند، چون تشویش حضرت بادشاہ بیشتر شد، طلب حضرت ہمایون بادشاہ کس فرستادند۔"

ہمایوں کو اس موقع پر آنا چاہئے تھا، آ گیا، یہ سوال ہی باقی نہیں رہتا کہ اس کی ماں نے کیوں نہیں بلایا؟

اب ہمایوں نامہ کے اس حصہ کی عبارت پر عمیق نظر ڈالنے کی کوشش کیجئے، جس کی بنا پر ہمارے فاضل مضمون نگار کا خیال ہے، کہ وہ ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کر رہا ہے، جس سے صدیوں کی مسلّم روایت محض کذب و افترا کی داستان بن جاتی ہے، اور اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے، کہ بابر اس زہر کے اثر سے مرا جو ابراہیم لودی کی ماں نے اس کو دیا تھا، ہمایوں سنبھل سے واپس آتا ہے، باپ کی نازک حالت دیکھ کر غیر معمولی طور پر متاثر ہو جاتا ہے، خدمت گاروں سے علالت کے متعلق استفسارات کرتا ہے، وہ خاموش رہتے ہیں، تو طبیبوں کو بلاتا ہے ان سے مرض کی شدت اور نوعیت کے بارے میں پوچھتا ہے، لیکن وہ کچھ نہیں بتاتے ہیں،

"حکما و اطبا چیزہا گفتند"[ل]

بابر کی علالت اور بھی زیادہ نازک ہو جاتی ہے، ہمایوں بے چین اور پریشان ہو کر طبیبوں کو اپنے حضور میں طلب کرتا ہے، لیکن وہ پھر کوئی معقول جواب دیکر اس کو مطمئن نہیں کرتے ہیں،:-

"اطبا و حکما را طلبیدہ گفتند نیک ملاحظہ کردہ، علاج تشویش حضرت نمایند اطبا و حکما جمع شدہ گفتند کہ کم طالعیہ مایان است کہ داروئی کارگر نمی شود، امید داریم

ل مسز بیورج نے اس جملہ کا جو انگریزی ترجمہ کیا ہے، وہ ملاحظہ ہو:-

They said this and that in reply.

از حضرت حق سبحانہ کہ از خزانۂ غیب کہ شفائے عاجل عطا کند"

ایک بار پھر ہمایوں کا اضطراب بڑھتا ہے، وہ پھر طبیبوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اس بار وہ ہمایوں سے کہتے ہیں کہ یہ علالت اس زہر کا نتیجہ ہے، جو ابراہیم کی ماں نے دیا تھا،

"اطبا بعرض رسانیدند کہ علامت ہمان زہر است کہ والدۂ سلطان ابراہیم دادہ بود۔"

گلبدن بیگم نے طبیبوں کی رائے کا محض حوالہ دیا ہے، اور اس زہر دینے کے واقعہ کی طرف اشارہ کرکے وہ دوسرے واقعات کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے، اگر اس رائے میں کچھ اصلیت ہوتی تو بابر کے مرض کی تشخیص میں طبیبوں کی بیچارگی اور عاجزی کا اظہار بار بار نہیں کرتی، اور اگر بابر کی موت اسی زہر کے اثر سے ہوئی، تو اس کو اس واقعہ کو درج کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس سے بابر کی دعا اور ایثار سے حسن عقیدت خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر چار برس کے بعد[ل] اس زہر کا مہلک ہونا، اور اس کی تشخیص بابر کی کئی مہینوں کی علالت کے درمیان میں نہیں، بلکہ ٹھیک موت کے قبل کرنا، ایک زود اعتقاد عورت کی دلچسپی کا تو سامان ہو سکتا ہے، مگر ایک مورخ کا اس کو تسلیم کر لینا اس کی فرض شناسی اور بصیرت کی دلیل نہیں بن سکتا، یہ واقعہ تو ایسا تھا کہ افغانوں اور لودیوں کے خلاف نفرت اور اشتعال پیدا کرنے کی خاطر تیموری دربار اور اس عہد کا ہر مورخ اس کی طرف اشارہ کرتا، مگر گلبدن بیگم کے ایک خفیف سے اشارہ کے علاوہ کسی اور تاریخ میں اس کا ذکر مطلق نہیں پایا جاتا ہے،

شکر ہے کہ ہمارے مضمون نگار کی دور رس نگاہیں دور تک نہیں پہنچیں، ورنہ ایک یورپین مورخ نے تو بڑی باریک بینی سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بابر کی موت اس زہر سے ہوئی جو ہمایوں نے خود اس کو دیا، اس کی چند سطریں ملاحظہ ہوں،

ل بابر کو زہر ماہ صفر ۹۳۳ھ میں دیا گیا،

"بابر کو زہر دیا گیا، گلبدن بیگم صاف صاف لکھتی ہے، کہ یہ رائے ان اطبار کی تھی، جو بادشاہ کے پاس آخر وقت میں موجود رہے، ایک آدمی اس فعل سے مستفید ہونا چاہتا تھا، اور صرف ایک ہی آدمی احتیاط سے اس جرم کے ارتکاب کا ذریعہ رکھتا تھا، وہ ہمایوں تھا، اس کی حمایت میں بہت کچھ باتیں بنائی گئی ہیں، جس سے اسکے متعلق شک اور بھی نمایاں ہو جاتا ہے، اسی لئے بیٹے کی معصومیت کو اتنی بلند آہنگی سے بار بار دہرانے کی ضرورت ہے،[1]

مذکورۂ بالا بیان اور استدلال کی تردید کی کوشش کرنا محض وقت اور محنت کو ضائع کرنا ہو [گا]

اب ایک سوال اور رہ جاتا ہے، کہ بابر کی دعا اور اس کے معجز نما اثرات کا ذکر مرزا حیدر دوغلت، ملا عبد القادر بدایونی اور فرشتہ کی تاریخوں میں کیوں نہیں ہے،؟ میرزا حیدر کی تاریخ رشیدی دراصل وسط ایشیا کے مغلوں کی تاریخ ہے، چنانچہ وہ انہی کی تاریخ تفصیل کیساتھ لکھتا ہے، بابر کے حالات ضمنی طور سے تحریر کرتا ہے، حالانکہ وہ اس کا خالہ زاد بھائی تھا، بابر اور ہمایو[ن] کی معیت میں ہندوستان بھی آیا، اور ان کی جانب سے ہندوستان ہی میں سرکاری عہدوں پر [فائز] رہا، لیکن پھر بھی بابر اور ہمایوں کے حالات لکھنے میں ہر جگہ بخل اور اختصار سے کام لیتا ہے، بابر نے ہندوستان میں جو اہم کارنامے انجام دئیے، ان کو چند سطور میں لکھ کر ختم کر دیتا ہے، ملاحظ[ہ ہو]

"بابر بادشاہ تمام قلمرو سلطان اسکندر افغان را متصرف شد، ورانا سنگھ راجہ ہندو بود با چند لک لشکر آمد و مصاف کرد، پادشاہ اورا شکست داد، و درمنا شیر خود غازی نوشت و بعد ازاں بطرف چتور رفت، آنجا غزوات شگرف و فتح ہا کرد ترف کردہ مراجعت نمود، و دوامی ضبط تمام ہندوستان داشت،

[1] فرمینڈ گری نارڈ، بابر فرسٹ آف دی مغلس ص۲۳۲،

در شہور سنہ سبع و ثلاثین و تسعمائۃ، چند مرض مزمن بر مزاج شریف مستولی شد اطبار ہر چند انکہ سعی نمودند مفید نیفتاد ....

چوں مشرف بموت شد ہمایوں مرزا کہ از بدخشاں طلب داشتہ و تمام امراء و خلق جہان را بوے سپرد و جہان را بجہان آفرین داد، انار اللہ برہانہ و نور مضجعہ"[2]

ظاہر ہے کہ ان چند سطور میں بابر کی زندگی اور موت کی تفصیلات تلاش کرنا، اور ان کو نہ پا کر محض قیاس سے کوئی ایک رائے قائم کر لینا، ایک فرض شناس اور ذمہ دار مورخ کا کام نہیں ہو سکتا [ان]

ملا عبد القادر بدایونی نے بابر کے پورے حالات صرف تین ورق میں لکھے ہیں، انکے یہاں تو بہت سی اہم تفصیلات اختصار کے خیال سے نظر انداز کر دیگئی ہیں، طبقات اکبری میں منتخب التواریخ سے زیادہ تفصیلات ضرور ہیں لیکن پھر بھی بہت سی باتوں میں تشنہ ہے، رانا سانگا کے مغلوب اور پسپا ہونے پر مسرت کا اظہار کر کے اس کا مصنف بابر کی موت کی تاریخ، اور اس پر چند اشعار لکھ کر ختم کر دیتا ہے، حالانکہ فتحپور سیکری کی جنگ اور بابر کی موت کے درمیان بہت سے ایسے اہم واقعات ہیں جنکا ذکر کرنا ایک مورخ کیلئے بہت ضروری تھا، فرشتہ نے بابر کے حالات طبقات اکبری سے بھی زیادہ مفصل لکھے ہیں مگر بابر کی علالت کے زمانہ کے واقعات کو وہ بھی نظر انداز کر گیا ہے، چنانچہ امیر خلیفہ کی معاندانہ کارروائیوں اور بابر کی آخری نصیحتوں کی طرف اشارہ اس نے مطلق نہیں کیا ہے،

اگرچہ یہ لوگ خاموش ہیں لیکن اس عہد اور اس کے بعد کے ہر دور کی تاریخوں میں اس واقعہ کی تفصیل موجود ہے، مآثر رحیمی اور تاریخ سلاطین چغتا کے مصنفوں نے اس واقعہ کے بیان میں اسی عقیدت اور اخلاص کا اظہار کیا ہے جو اس غیر معمولی سانحہ کی اثر پذیری کا نتیجہ ہونا چاہیئے، اگر یہ لوگ بھی خاموش رہتے تو گلبدن بیگم کی "ہمایوں نامہ" اس واقعہ کو تازہ رکھنے کیلئے کافی تھی، جس میں معنوی حیثیت سے وہی بات پائی جاتی ہے، جو اکبر نامہ کے مصنف نے لکھی ہے،[3] اور یہی وجہ ہے کہ مسز بیورج کو بھی اس واقعہ کے یقین کرنے میں تامل نہیں ہوا

[2] تاریخ رشیدی از میرزا حیدر دوغلت، قلمی نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ ص۵۲ [3] بابرنامہ ترجمہ انگریزی ص ۷۰۲

مغالطۂ تحلیل

از

جناب خواجہ عبد الحمید صاحب لکچرار فلسفہ گورنمنٹ کالج، گجرات پنجاب

(۲)

۔۔ مابعد الطبیعیات کا مفکر ہرگز یہ جسارت نہیں کریگا، کہ عمل ترکیب کی صحیح اہمیت کا انکار کردے وہ جانتا ہے کہ کائنات اور اس کے لاتعداد مسائل کے صحیح ادراک اور عرفان کے لئے ترکیبی نقطۂ نگاہ لابدی ہے، وہ تحلیل کی اہمیت سے واقف ہے، لیکن تحلیل کی کم نگاہی بھی اسکی آنکھوں سے چھپی نہیں افسوس یہ ہے کہ باوجود اس اعتراف کے جب وہ خود اپنے ذہن میں کائنات کا تخیل اپنے تصورات کی مدد سے قائم کرتا ہے، تو تحلیل کا تباہ کن فارمولا (ا = ج + د) جگہ جگہ اپنی کرشمہ سازی میں مصروف نظر آتا ہے، اسکے دو وجوہ ہیں، اول یہ کہ تحلیل ہر حالت میں ترکیب سے آسان تر ہے، دوم یہ کہ مفکر مابعد الطبیعیات عموماً اپنے زمانہ کی سائنس کا تربیت یافتہ ہوتا ہے، یا کم از کم اُسے اس سائنس سے اچھی خاصی واقفیت ہوتی ہے، (اور بغیر اس واقفیت کے وہ مابعد الطبیعیات میں فکر کے قابل بھی نہیں) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سائنس کا تحلیلی طریق کار اسکی اپنی سرشت میں سرایت کرجاتا ہے، اور دانستہ یا نادانستہ وہ بھی اسی نقطۂ نگاہ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیکر اپنی تخیلی دنیا کی تعمیر کرتا ہے،

ہم یہ نہیں کہتے کہ مابعد الطبیعیات کے ہر مفکر کے حق میں یہ قیاس صحیح ہے، زمانہ قدیم سے آج تک مفکرین و فلاسفہ اپنے ذہنی مزاج کے لحاظ سے دو فریقوں میں منقسم رہے ہیں، جرمن مفکر نٹشے نے ان دو فریقوں کو آپولوڈی[۱] اور دنیاسوی کے القاب دیئے ہیں، ہم ان دو فرقوں کو اہل برہان اور اہل دل کہہ سکتے ہیں، قدیم یورپ کے فلاسفہ میں ان دو فریقوں کی بہترین مثال ارسطو اور افلاطون کا باہمی اختلاف ہے، ارسطو اپنے علم و سائنس سے اور اپنی منطق و استدلال سے حق و عرفان تک پہنچنا چاہتا ہے، اس کے برعکس افلاطون اپنے کشف و نظر سے اور اپنے شاعرانہ تخیل، اور درک مستقیم[۲] سے اسی حق و عرفان تک جانا چاہتا ہے، ایک عقل کا پرستار ہے، دوسرا دل کا گرفتار، ان دو مختلف ذہنیتوں کے لئے ایک ہی جادہ پر چلنا اور ایک ہی قسم کا طریق کار رکھنا ناممکن ہے، نصب العین دونوں ایک ہی سمجھتے ہیں، یعنی حق و عرفان، لیکن اگر ایک حق و عرفان سے وصل کا خواہشمند ہے، تو دوسرا اسی حق و عرفان کی پوری پوری پیمایش کرنا چاہتا ہے، ایک کو دوسرے کا طریقہ پسند نہیں، اور اسے وہ جادۂ حق سے ہٹا ہوا سمجھتا ہے، حکیم رومی اپنے استدلالی اور عقلی نخالفین کو صرف پائے چوبیں کی اجازت دیتا ہے، اور فوراً ہی اس کی بے تمکینی کی تشہیر بھی کردیتا ہے، کیا عقل کے پرستار خاموش ہیں، ؟ ہرگز نہیں، وہ افلاطونی سیرت کو شاعرانہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں، اور اس کے درک مستقیم کو اہل باطن کی ڈینگ سمجھتے ہیں، یہاں ان مخالف ذہنی کیفیتوں کا موازنہ منظور نہیں، صرف یہ عرض کرنا ہے کہ ان دو ذہنیتوں میں سے ارسطوئی مزاج والوں کا رجحان تحلیل کی طرف غالب رہتا ہے، اور افلاطونی طبیعتیں ترکیب کی طرف

[۱] آپولو، یونانی، دیو مالا میں آفتاب اور علم و فضل کا دیوتا تھا، اور دیناؤس، راز و نیاز اور وارفتگی کا،

[۲] درک مستقیم ([illegible]) سے مراد کسی حقیقت کا پا جانا ہے، بغیر دلیل و حجت کے[۳] یاد رہے کہ ارسطو خود تحلیل و ترکیب کے اشتراک عمل کی بہترین مثال ہے، ارسطوی ذہنیت سے مراد صرف یہ ہے کہ طبیعت کا میلان تحلیل کیطرف زیادہ ہے

زیادہ مائل رہتی ہیں، جب ارسطوی علم و سائنس میں سے ترکیب کا عنصر بالکل غائب ہو جاتا ہے، اور جب افلاطونی درک ونظر میں محتاط و مکمل تحلیل بالکل معدوم ہو جاتی ہے، تو دونوں عرفان کے باو حق سے ہٹ جاتے ہیں، فلسفہ کی تاریخ اسی کشمکش کی تاریخ ہے،

یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ افلاطونی مزاج مفکر عملِ تحلیل سے متنفر ہے، اسلئے وہ نہایت آ سے مغالطۂ تحلیل سے بچ جاتا ہے، اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ زیادہ صحیح نظر اور صاحبِ فضیلت ہے وجہ صرف یہ ہے، کہ وہ یا تو اپنی طبیعت کے جبلی میلان سے مجبور ہو کر اور یا تحلیل کی کوتاہیوں اور اسکی کم نگاہی سے متاثر ہو کر اس عمل سے گریز کرتا ہے، بہر حال چونکہ وہ اس مغالطہ سے بچ جاتا ہے، اس لئے اس کے تخیل میں دوسروں کے لئے ایک قسم کی کشش ضرور ہوتی ہے، یہی ر ہے کہ ایسے مفکرین کی تصانیف ہمیشہ قارئین کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں مضبوطی سے لے لیتی ہیں، قدیم یورپ میں ہیراقلاطیس، افلاطون اور پلاطینس زمانۂ حال میں نطشے اور برگ اس ذہنیت کی بہترین مثالیں ہیں[1]، دنیائے اسلام کے اکثر صوفی شعرا اور ان کے سرتاج رومی او حال میں اقبال (اپنے آخری بیس سالوں میں[2]) یہی ذہنیت پیش کرتے ہین، اس طرح قدیم ہندو میں فلسفہ، ویدانت نے بھی یہی تعلیم پیش کی تھی[3]،

جب ایسے افلاطینی مفکر[4] کے سامنے اس کا برہانی مخالف اپنے خود تراشیدہ تصورات اپنے خشک دلائل اور اپنے صبر آزما استدلال کو پیش کرتا ہے، تو وہ اس فلسفہ سے اپنی نفرت کا اظہار کرتا ہے، اور اسے نیم کور، چوبیں لنگ، محدود، عقیم و بے حاصل کرگس وغیرہ کے خطابات

[1] یہاں صرف ذہنیت (نفس مزاج) کا ذکر ہے، ورنہ اپنے نظریوں میں ان مفکرین میں بعد المشرقین ہے،

[2] ع مقامِ عقل سے آسان گذر گیا اقبال،[3] بلکہ ہندوستان میں تو حکما کے تخیلی نظام کو فلسفہ کے بجائے درشن کے نام سے یاد کیا گیا ہے، درشن میں درک مستقیم ہے اور بس کشف ہے، استدلال شامل نہیں،

عطا کرتا ہے اس کے برعکس وہ خود اپنے کشف ونظر کو اور اپنے درک مستقیم کو عرفان و حق کا صحیح نمونہ اور حامل گردانتا ہے،

بو علی اندر غبارِ ناقہ ماند دستِ رومی پردہ محمل گرفت،

برہانی فلسفہ بیچارہ اپنی آنکھوں کا تیل نکال کر مشکل سے مشکل مسائل کی تحلیل کرتا ہے، اپنے آلات کی مدد سے "وجود مخلوط" کا ایسے اجزا میں تجزیہ کرتا ہے، جن سے آگے بڑھنا (یا یہ کہو کہ نیچے اترنا) فی الحال ناممکن ہے، اور اسے اپنی اس محنت شاقہ کا پھل کیا ملتا ہے، ؟ نیم کوری اور بے حاصلی؟ وہ نظام عالم کے صحیح ادراک کے لئے اپنے ذہن میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے، اور اسے وجود منفرد، جوہر فرد اور برقیہ تک پہنچا دیتا ہے، لیکن اسے اپنی اس دیدہ ریزی اور کاوش کا صلہ کیا ملتا ہے، ؟ افلاطونی رومی منش شاعر جو اسے سات اندھوں اور ایک ہاتھی والا قصہ سنا دیتا ہے، ! سائنسدان دیدہ ریزی کر کے سفیدہ سلول کی تحلیل اس کے کیمیاوی اجزا میں کر دیتا ہے، اور خوش ہوتا ہے، کہ کائنات کا مشکل ترین عقدہ میری محنت سے آخر کھل گیا، لیکن اقبال فوراً ہی کرگس کی طرف انگشت نمائی شروع کر دیتا ہے، ! بات یہ ہے کہ اہل دل اور افلاطونی مزاج، منکر استدلال کے تکلیف دہ دار ورسن سے آزاد رہنا چاہتے ہیں، ان کے لئے تو التجائے اَرِنی سرخی افسانۂ دل ہے،

حق یہ ہے کہ وہ استدلال تحلیلی صرف اس حالت میں صحیح اور مفید ہوتا ہے، جب ہم اس کے خود وضع کردہ حدود کو ذہن نشین رکھیں، تحلیل بہ حیثیت تحلیل صحیح ہے، لیکن جب تحلیل نے ترکیب کی جگہ لینا شروع کی تو تحلیل مغالطہ بن گئی، اگر تحلیلی سائنسدان صرف یہ کہے کہ ان طریقوں سے اگر سفیدہ سلول کی تحلیل کیجائے تو یہ کیمیاوی اجزا ہاتھ آئیں گے، لیکن ان کیمیاوی اجزا میں وہ عنصر حیات دکھائی نہیں دیتا، جو سفیدہ سلول کا طغرائے امتیاز تھا تو کسی کو اس تحلیلی سائنس دان پر اعتراض کرنے کی گنجائش نہیں، لیکن جب وہ تحلیل کر کے دعوی کرتا ہے، کہ بس سفیدۂ سلول کا صحیح فہم و ادراک ہمیں ہو گیا، اور حیات کا لاینحل عقدہ

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھل گیا ہے، تو کیا حرج ہے، اگر معترض ذرا گرگس کی طرف بھی اشارہ کردے،

۸۔ اس بحث سے ضمناً یہ ایک حقیقت کھلتی ہے کہ معرفت حق کے درجے ہیں، سب سے نچلا درجہ وہ ہے، جس میں عوام کھڑے ہیں، یعنی حق کا وہ ادراک جو تھوڑا بہت ہر اس انسان کو ہوتا ہے، جو علم نظری و عقلی کا نابلد ہے، اس عام ادراک میں تحلیل بھی کام دیتی ہے، اور ترکیب بھی، ان دو اہم عملوں کے توازن سے روزمرہ کے کام چلتے ہیں، عام[1] انسان توڑتا ہے، اور جوڑتا بھی ہے، بات کی تہ کو بھی پہنچنا چاہتا ہے، اور نئی بات کا اختراع بھی چاہتا ہے، لیکن جب وہ عام ادراک کے درجہ سے نکل کر مدرسہ یا دار التجربہ میں جا داخل ہوتا ہے، یا اہل دل کے شعر و سخن، اور ان کی ہائے وہو سے حق و عرفاں کی منزل تک پہنچنے کے لئے وہ استدلال چوبین، کی لمبی اور خشک سڑک کو چھوڑ کر درک مستقیم کی مختصر پگ ڈنڈی کو اپنے لئے پسند کرتا ہے، تو عقلی اور نظری خطرات قدم قدم پر اُسے گراتے ہیں، جس وقت علم میں تخصص[2] شروع ہوتا ہے، تو عمق نظر، اور تنگی نظر، دونوں یکجا ہو جاتے ہیں، جس خاص موضوع میں سائنسدان تخصص کرتا ہے، اس میں وہ عمق نظر پیدا کرتا ہے، اس کی چھان بین کرتا ہے، اور اس کی ہر بات کی کھال نکالتا ہے، لیکن اس موضوع کے تنگ حدود کے باہر وہ اپنی نظر ہرگز نہیں دوڑاتا، ان حدود سے جو کچھ باہر ہے، گویا اس کے لئے ہے ہی نہیں، اُس سے اُسے کوئی سروکار نہیں، سائنس کے لئے یہ تخصص ضروری ہے، اور جب تک سائنسدان اپنے ان خود ساختہ حدود کو ان کی نوعیت کو اور ان کے مقصد کو اپنے ذہن نشین رکھتا ہو اسکو اس قسم کا عقلی و نظری خطرہ نہیں لیکن جب کوئی فلسفی یا کوئی اور مفکر سائنس کے اس تخصص کے نتائج کو اپنے کونی تخیل کی عمارت میں بجنسہ استعمال کرتا ہے، اور سائنس دان کے حدود ان کی نوعیت اور اس کے محدود مقاصد کو مدنظر نہیں رکھتا، تو اس مفکر کا کونی تخیل یکسر غلط ہو جاتا ہے، سائنسدان کونی تخیل کی عمارت کا معمار نہیں ہے، اور نہ وہ اس کام کے لئے اپنے آپ کو اہل سمجھتا ہے، وہ صرف یہ کہتا ہے کہ فلاں فلاں حالات میں فلاں فلاں حدود کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس اس مراد کو استعمال

ecialixtin ۲ Man in the street. ۱

کرتے ہوئے ان ان آلات کی مدد سے اور اس طریق کار کے استعمال سے یہ یہ نتائج (تحلیلی یا ترکیبی) ظاہر ہوتے ہیں، اگر وہ اس سے زیادہ دعوی کرے، تو وہ قابل مواخذہ ہے، اور اگر اسکی اس تحدید کے باوجود کوئی مفکر اس کے نتائج کو وہ کونی اہمیت دے، جس کا خود سائنس دان مخترع دعویدار نہیں ہے، تو اس پر ہم سائنس اور اس کے کام اس کے طریق کار، اور اس کے نتائج پر کسی قسم کی گرفت نہیں کر سکتے، غلطی اگر سرزد ہوئی ہے، تو مفکر سے ہوئی ہے، جس نے خاص اور محدود نتائج کو ایک عام غیر محدود اور کونی اہمیت دیدی ہے،

۹۔ یہ امر واقعہ ہے کہ زمانۂ حال کی سائنس میں عمل تحلیل نے بے شمار انکشافات اور اختراعات کئے ہیں، ہر طرف سائنس کے تحلیلی (اور ترکیبی) کرشمے دکھائی دیتے ہیں لیکن اگر ہم ان انکشافات اور اختراعات کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں نہ صرف عمل تحلیل کی صحیح اہمیت اور اسکی کامیابی کا راز معلوم ہو جائے گا، بلکہ اسکی کوتاہیاں اور اسکی حدود بھی ذہن نشین ہو جائیں گی،

۱۔ مثلاً یہ حقیقت ہے، کہ ان انکشافات، اختراعات اور ایجادات کا کثیر حصہ عالم غیر ذی حیات سے متعلق ہے، موٹر کاریں، طیارے، ریڈیو، آلات حرب، کیمیاوی مرکبات، بجلی کے آلات و اختراعات میکانوی آلات وغیرہ ایسی اشیا ہیں، جن میں، حیات، شعور، اور روحانیت کے عناصر بالکل مفقود ہوتے ہیں، یہی وہ عالم غیر ذی حیات ہے جس میں خالص تحلیل (یعنی وہ تحلیل جس میں عمل ترکیب کا بالکل دخل نہ ہو) نہ صرف ممکن اور مکمل ہو سکتی ہے، بلکہ اس کے نتائج بھی نہایت اہم، نہایت مفید، اور (نظری حیثیت سے) کم گمراہ کن ہو سکتے ہیں، لیکن کائنات کا وہ حصہ جس میں حیات اور شعور کو دخل ہے، صحیح نتائج کے لئے تحلیل خالص و محض متحمل نہیں، پھر عالم غیر ذی حیات کے اجسام غیر آلیہ میں عمل ترکیب نسبتاً آسان بھی ہوتا ہے، سائنسدان اپنے دار التجربہ میں نہ صرف وجود مخلوط کو اجزائے مرکبہ میں تحلیل کر سکتا ہے، بلکہ ان اجزا کو دوبارہ باہم دگر جمع کر کے یہ فیصلہ بھی کر سکتا ہے کہ تحلیل کا

پہلا عمل صحیح تھا یا نہیں، اس سے بڑھکر یہ فائدہ ہے، کہ وہ مختلف اجزاء کو لیکر (یعنی ایسے اجزار کو لیکر جو مختلف تحلیلوں کے بعد ہاتھ آئے ہیں،) نئی نئی ترکیبیں دیکر، نت نئے مخلوط وجود اور اختراعات کر سکتا ہے، اس طرح سے وہ نہ صرف عالم غیر ذی حیات، موجودات کی تحلیل کر سکتا ہے، بلکہ اس عالم کی موجودات مین آئے دن نئے اضافے بھی کرتا رہتا ہے، مثلاً جنگ عظیم سے پہلے کا واقعہ ہے، کہ موجودات ارضی میں اس قدر رنگ موجود نہ تھے جتنے کہ جرمن کیمیاوی تجربہ گاہوں میں صنعتی طریقون سے سائنسدانون نے اختراع کر لئے تھے،

پس ظاہر ہوا کہ موجودہ زمانہ میں عمل تحلیل کی کامیابی کی دو وجوہ ہیں، اوّل یہ کہ یہ عمل عالم غیر ذی حیات میں استعمال ہوا، جہاں یہ عمل بُرے نتائج پیدا کئے، بغیر اور زیادہ آسانی سے استعمال ہو سکتا ہے، دوم کہ اس عالم غیر ذی حیات میں جس طرح عمل تحلیل آسان ہے، اسی طرح عمل ترکیب بھی مشکل نہیں، اسلئے جہان تحلیل سے کوئی نتیجہ برآمد ہوا، اس نتیجہ کی دیکھ بھال اور اسکی خامیوں اور کوتاہیوں کی جانچ پڑتال فوراً عمل ترکیب سے کر لی گئی، یعنی ہر قدم پر ترکیب نے تحلیل کے نتائج کا جائزہ لیا، اور اس طرح سے نہ صرف تحلیل کی غلطیوں سے سائنس بچتی رہی، بلکہ ترکیب کی مدد سے نئی نئی اختراعات اور ایجادات اور نت نئے مرکب اور مخلوط وجود بھی ظاہر ہوتے رہے، اس لئے یہ کہنا صحیح نہیں ہے، کہ موجودہ سائنس کی ترقی زیادہ تر عمل تحلیل کے صحیح اور وسیع استعمال سے ہوئی ہے، ترکیب کے بغیر یہ ترقی اگر ناممکن نہیں تو کم از کم مشکل اور سست رفتار ضرور ہوتی، حق یہ ہے کہ سائنس کی ترقی کی رفتار اس تناسب سے ہے، جس سے اسکی ترکیب اور تعمیم بڑھتی گئی ہی،

(باقی)

فہم انسانی

یعنی ڈیوڈ ہوم کی مشہور کتاب "ہیومن انڈراسٹینڈنگ" کا ترجمہ، اور اس کے مختصر حالات کیساتھ اسکے خیالات فلسفہ پر بحث و تبصرہ، حجم ۲۰۱ صفحات، قیمت عہ

"مینیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے وسط ایشیائی مقبرے

مندرجۂ بالا عنوان سے ایک ڈچ اہل قلم ڈاکٹر ہرمن گوئٹز نے اکتوبر ۱۹۳۸ء کے اسلامک کلچر میں ایک مقالہ لکھا ہے، ذیل میں ناظرین معارف کے لئے اسکی تلخیص درج ہے،

ہندوستان کا سب سے زیادہ مشہور اور شاندار مقبرہ تاج محل ہے، اس کا طرز تعمیر آرٹ کے طلبہ کے لئے اب تک معمّا ہے، کہ وہ ہندوستانی طرز کی نمایندگی ہے، یا اس میں غیر ملکی عناصر ہیں، یہ خیال کہ اسکے معمار فرانسیسی اور اطالوی تھے، لغو اور مضحکہ انگیز ثابت ہو گیا ہے، لیکن اس کے معمار غیر ملکی ضرور تھے، استاد علیی اور اسماعیل خان ہندوستانی نہ تھے، اسی لئے تاج میں غیر ملکی اثرات نمایاں ہین، جو زیادہ تر وسط ایشیا کے ہیں، لیکن ان کو خالص وسط ایشائی آرٹ بھی نہیں کہا جا سکتا، کہ اس میں ہندوستانی عناصر بھی کافی ہیں،

تیموریون سے پہلے مسلمانون کے فن تعمیر کو کافی فروغ حاصل ہو چکا تھا، یہ سلطان التمش کے سادہ اور حسین مقبرہ سے شروع ہوا، اور شیر شاہ کے مقبرہ کی سادگی اور تناسب کے مکمل نمونے پر ختم ہوا، عہد تغلق کے مقبرے سادہ اور چوپہل ہوتے تھے، جن کے سامنے چار چھتیں، اور چھوٹی چھوٹی برجیاں ہوتی تھیں، آگے چل کر ایرانی اثرات سے چارون کونوں پر گنبدون کا بھی اضافہ ہوا لیکن پھر جلد ہی ان کی جگہ ہندوستانی وضع کی چھتریوں نے لے لی، آخری عہد میں ہشت پہل اور کثیر الاضلاع

عمارتیں بھی بننے لگیں جن میں گیلریوں اور چھتریوں کی تعداد زیادہ ہوتی تھی، اور ان کی برجیوں کے بیچ کا حصہ اونچا ہوتا تھا،

تیموریوں کے زمانہ سے مقبروں میں وسط ایشیائی طرز شروع ہوا، جو ایران اور ترکستان میں یہاں کی دونوں قوموں کے تخیل کا نتیجہ تھا، یہ طرز سمرقند اور ہرات میں خاندان تیموریہ کے عہد میں پایۂ تکمیل کو پہنچا، اس سے پہلے سلجوقیون نے اپنے مقبرون میں خیمہ کی شکل کا ایک جدید قسم کا مینار شروع کیا تھا، جو [illegible] کے دور حکومت میں اس مینار کی شکل [illegible] میں تبدیل ہوگئی، تیمور کے زمانہ میں وسط ایشیا کے پیازی[۱] قبے اعلیٰ پیمانہ پر پہونچ گئے تھے، ایلخانیوں کے عہد میں برجیوں والے میناروں میں ایرانی طرز کی چھتین گیلریوں کے ساتھ ہوتی تھیں، اس قسم کی برجیاں اور مینارے دہلی کے ترک سلاطین کے مقبروں میں بالکل ناموزوں ہین، اور وہ ان مقبرون کے اوپر بڑے بڑے تاج کی طرح نظر آتے ہیں،

ہندوستان میں اصلی اور سادہ تیموری وضع کے مقبرہ کا بہترین نمونہ نورجہاں کے باپ آصف خان کا مقبرہ ہے، اسکے وہ روشن اور رنگین ٹائل محفوظ ہیں، جو ازمنۂ وسطیٰ میں ترکستان اور ایران کی عمارتوں میں استعمال ہوتے تھے، تاج محل کے پاس ممتاز محل کی خواصون کے چھوٹے چھوٹے مقبروں میں بھی یہ نمونے اچھی حالت میں موجود ہیں، ان کے چھوٹے اور گول ستون مغلوں کے لال پتھر، اور دہلی کے ترک سلاطین کے زمانہ کے سفید پتھرون سے مزین ہین،

وسط ایشیائی طرز کے ابتدائی نمونے دہلی میں اعظم خاں، ہمایوں اور خانخانان اور فہیم خان کے مقبرون میں پائے جاتے ہیں، خانخانان اور فہیم خان کے مقبرے تو خالصۃً اسی وسط ایشیائی طرز پر بنائے گئے ہیں، گو موخرالذکر میں نیلے اور سبز رنگ کے ٹائل کے گنبدوں سے زیادہ حسن پیدا ہوگیا ہے، ہمایوں اور اعظم خان کے مقبرے بھی اسی طرز کے ہیں، لیکن ان میں سنگ موسیٰ اور دوسرے قسم کے

[۱] یعنی پیازی شکل کے،

رنگ برنگ کے اتنے پتھر ہیں کہ تیموریوں سے پہلے سلاطین دہلی کے زمانہ کا طرز پیدا ہوگیا ہے، جو اکبری دور کے آرٹ میں قبول کر لیا گیا تھا، ہمایوں اور خانخاناں کے مقبروں کو تاج کے نقوش اولین سمجھا جاتا ہے، ہمایوں کے مقبرہ کی ترتیب اور خاکہ تاج محل سے بہت مشابہ ہے، گو اس میں تاج کی پختگی نہیں، اور وہ ایک سادہ ترکستانی مقبرہ اور دہلی کے شیر منڈل کے وضع کے چار نشستہ نشینون کا تودہ معلوم ہوتا ہے، خانخانان کے مقبرہ میں چوپہل فرش اور متروک چھتریوں کے باوجود ہمایوں کے مقبرہ سے نسبۃً زیادہ تاج کی مشابہت ہے،

اکبر کے آخری اور جہانگیر کے ابتدائی دور سے وسط ایشیائی طرز کے مقبرہ کا ذوق نہ رہا، اکبر نے جب راجپوتوں اور ہندوؤں کے عادات و اطوار اختیار کرنا شروع کئے، تو اس کے اثرات تیموریوں کی تہذیب، معاشرت، علم، مذہب، اور آرٹ پر بھی ظاہر ہونے لگے، لیکن جہانگیر کے آخری عہد سے پھر ایرانی تمدن کے آثار نمایاں ہوئے، نورجہاں اور اس کے خاندان کے اثر سے ایرانی لباس، ایرانی مصوری، اور ایرانی طرز تعمیر رائج ہوا، ایرانی طرز کی عمارتوں کی بہترین مثالیں وزیر خاں اور دائی انگا کی مسجدیں ہیں، ایرانی طرز میں ترکستانی عناصر بھی شامل تھے، اس طرز کے رائج ہونے سے وسط ایشیائی وضع کی بھی تجدید ہوئی، چنانچہ لاہور مین انارکلی اور آصف خان کے مقبرے اسی طرز پر تعمیر ہوئے، اور آگرہ میں چینی کا روضہ اور خان ملا شکراللہ کا مقبرہ بنا، شاہجہاں کے زمانہ میں یہی روایات پھیلیں اور تاج میں ان کی پوری تکمیل ہوئی، شاہجہاں اپنے کو تیمور کے ترکی گھرانے کا منتہائے کمال سمجھتا تھا، تیمور سے اسکو خاص عقیدت تھی، اسی لئے صاحبقران ثانی کا لقب اختیار کیا، اسلئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ صاحبقران ثانی نے اپنی محبوب ملکہ کا جو مقبرہ تعمیر کیا، وہ اسی طرز کا تھا، جو صاحبقران اول نے اپنے لئے سمرقند میں بنایا تھا، بیگمات کے لئے عظیم الشان مقبرے بنانے کا رواج ترکستان ہی میں تھا، ہندوستان میں مطلق نہ تھا،

وسط ایشیائی مقبرے کی تصوریت کا اظہار تاج سے زیادہ کسی اور مقبرہ میں نہیں ہوتا ہے
لیکن یہ واضح رہے، کہ تاج سمرقند کے آرٹ کے جمالیاتی اور روحانی تخیل کی تکمیل سے بہت دور ہے
سمرقند کا مقبرہ سنگین حقیقت پسند، مردانہ اور مختلف قسم کے رنگوں سے مزین ہے، اس کے مقابلہ میں
تاج ایک خواب کی دنیا ہے، ایک عورت ہے، جو بے داغ سفید لباس میں کھڑی ہے، وہاں
دنیا کا ایک فاتح سویا ہوا ہے، یہاں ایک رفیقہ حیات محبوبہ محو خواب ہے،

تاج کا فانوس خیال شاہجہانی دربار کے کلچر کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے، اس میں ایک دنیاوی
روحانیت ہے، جو شاہی خاندان کے صوفیانہ تنویر سے پیدا ہوئی، ہندوستان کے آرٹ میں تصوف
کا مظاہرہ جہانگیر کے آخری دور حکومت سے شروع ہوگیا تھا، لیکن شاہجہان کی حکومت میں یہ
صوفیانہ رنگ آرٹ اور تمدن کے ہر شعبہ میں نظر آنے لگا، چنانچہ یہی تصوف روحانیت اور غیر مادی حقیقت
تاج اس کے سفید پتھروں، اس کے خیرہ کرنے والے جواہرات، اس کے فنی تناسب میں نمایاں ہیں، اور
اس کا خاص حسن ہے،

تاج محل کی تعمیر وسط ایشیائی طرز کے مقبرہ کی تکمیل ہے، اور اس کا آرٹ ہندوستان مغلون
کے تکوینی تخیل کا کمال ہے، جو بیرونی اور غیر ملکی نہیں کہا جاسکتا، تاج کے آرٹ کو نقل کرنے کی کوشش
کی گئی، لیکن اس میں کبھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی، اورنگ آباد میں بی بی کے روضہ میں اس کی تھوڑی
سی جھلک ہے، مگر روضہ میں جو فنی رجحانات اور انسانی تخیلات پائے جاتے ہیں، وہ تاج سے بالکل
مختلف ہیں، اس میں تاج کا ایرانی طرز تناسب اور اسکی روحانیت مطلق نہیں، گو یہ خود ایک انوکھے
طرز کی عمارت ہے، تاج سے انسانی عشق اور روضہ سے انسانی شفقت کا اظہار ہوتا ہے، تاج
کی افقی اور عمودی ساخت سے تناسب اور ترتیب کا حسن پیدا ہوگیا ہے، لیکن روضہ کی تعمیر میں ساری
توجہ نیچے سے اوپر کی طرف منعطف کی گئی ہے، بیچ والے گنبد پر اتنی اہمیت دی گئی ہے، کہ ساری

عمارت اسی کے ساتھ سمٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے، اس کے مینارے اس کی چھتریاں اور اس کی
چھتیں اس طرح بنائی گئی ہیں، کہ صرف مرکزی گنبد نمایاں ہوگیا ہے، اسی لئے اس میں تاج کی
شوکت اور سطوت پیدا نہ ہوسکی، تاج اپنے میناروں پر حاوی ہوگیا ہے، لیکن روضہ پر اس کے
مینارے حاوی ہوگئے ہیں، روضہ میں بیچ والی نہر کے کنارے ایک چھوٹا مگر لمبا باغ ہے، جس کے
دونوں جانب چھوٹی چھوٹی فصیلیں ہیں، اس کی روش کی فضا میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ روضہ
میں آرام کرنے والے اور اس کے بنانے والے میں بڑا انس تھا، اس کا اظہار روضہ کی آرائش،
اوس کی نوکدار محرابوں کے چھوٹے چھوٹے روزن اور دیواروں کی استرکاری سے بھی ہوتا ہے،
اس قسم کی نسائیت تاج میں بھی ہے، لیکن اس کی نسائیت میں ایک مقدس تخیل کی
صوفیانہ شوکت ہے، جس سے ایک پر شکوہ حکمران اور سپہ سالار کی شرمیلی بیوی کی محبوبیت کا
اظہار ہوتا ہے،

دہلی میں صفدر جنگ کے مقبرہ میں بھی تاج کی جھلک ہے، لیکن یہ محض ایک ایسے خود رو شخص
کا خواب ہے، جو مغلون کی زوال پذیر سلطنت سے فائدہ اٹھا کر اپنی علحدہ سلطنت قائم کر رہا تھا
یہ مقبرہ گذشتہ شاندار روایات کی محض نقالی ہے، جس میں اس زمانہ کے ذوق کا جمالیاتی پہلو زیادہ
نمایان ہے، اس کے باغ کی روشیں اس عہد کی درباری زندگی کا مکمل نمونہ ہیں، لیکن مجموعی حیثیت
سے یہ ایک ناکام آرٹ ہے،

اورنگ زیب کے بعد عالی شان مقبروں کی تعمیر کا ذوق ختم ہوگیا، خود اورنگ زیب
اور اس کی بہن کسی مقبرے میں مدفون نہیں ہیں، حیدرآباد اور بھوپال کے فرمانرواؤں نے بھی
بڑے مقبرے بنانے کی طرف توجہ نہیں کی، یہ اس لئے نہیں کہ ہندوستان میں دولت کی کمی ہوگئی،
بلکہ اس لئے کہ مذہب میں راسخ العقیدگی زیادہ ہوگئی، اودھ اور مرشد آباد کے نوابوں نے مقبرے

بنائے، لیکن ان سے پرانی روایات مفقود ہوگئیں فیض آباد اور لکھنؤ کے مقبروں میں دکنی شیعوں کے
اثرات زیادہ غالب آگئے ہیں، اور یہی طرز سرنگاپٹم اور ویلور کے مقبروں میں ہے،

بہرحال، مغلوں نے ہندوستان میں وسط ایشیائی مقبروں کے طرز کو رائج کیا، تو یہ
غیر ملکی ترک اور ایرانی فاتحوں کا قومی طرز تھا، لیکن تاج میں یہ غیر ملکی عناصر مغلوں کے کلچرل اور
تمدنی ارتقاء سے مل کر ایک روحانی کمال میں تبدیل ہوگئے، جس سے تاج ہندوستانی آرٹ کا
ایک بہترین جوہر ہوگیا،

"ص ع"

چودھویں صدی کی تفسیر کبیر،

تفسیر جواہر

مصر کے مشہور عالم شیخ طنطاوی جوہری نے تفسیر جواہر کے نام سے پچیس جلدوں میں قرآن
مجید کی تفسیر لکھی ہے، جو اپنی نوعیت اور معنوی محاسن کے لحاظ سے زمانہ حال کی تفسیروں میں یگانہ
حیثیت رکھتی ہے، اس میں شیخ موصوف نے جہان سیاست واقتصاد، فلسفہ، وسائنس، فلکیات وطبقات
الارض وغیرہ عصری علوم پر قرآن پاک کی آیتوں سے استشہاد کیا ہے، وہاں سلف کی تفسیر کی
بھی پوری پوری پابندی کی ہے، ابھی اس کی پہلی جلد کا ترجمہ نہایت سلیس، عام فہم ہندوستانی زبان
میں کیا گیا ہے، جو صرف سورہ بقر کی تفسیر پر مشتمل ہے، شروع میں علامہ سید سلیمان ندوی کا بصیرت افروز
مقدمہ بھی ہے، مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈھ، کاغذ سفید ولایتی ۴۴ پونڈ اور کتابت وطباعت دیدہ زیب
ضخامت ۵۰۰ صفحے قیمت سے ر علاوہ محصولڈاک، ملنے کا پتہ:-

سکریٹری عمر لائبریری عمر آباد متصل آمبور ضلع شمالی ارکاٹ (صوبہ مدراس)

اخبار علمیہ

سائنس کانگریس کا اجلاس لاہور

امسال سائنس کانگریس کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا، ڈھاکہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جے، سی گھوش
صدر تھے، گورنر پنجاب نے اجلاس کا افتتاح کیا، اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر خان بہادر میاں
افضال حسین صاحب نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا، کانگریس میں ۷۵۶ مضامین پڑھنے کے لئے موصول
ہوئے تھے، جن میں سے ریاضی میں ۹۴، کیمیا میں ۲۰۰، ریاضیات میں ۱۶، علم نباتات میں ۴۵، علم
الحیوانات میں ۵۴، علم الانسانیات میں ۲۶، طب میں ۹۴، زراعت میں ۵۶، عضویات میں ۳۲، اور
نفسیات میں ۵۵ مضامین تھے،

شعبۂ ارضیات کے صدر پروفیسر اس کے رائے تھے، جنھوں نے اپنے خطبہ میں کہا، کہ ہندوستان
کی معدنی دولت کثرت سے محض اسلئے برباد ہورہی ہے، کہ اس کی کان کنی کے لئے کوئی با اصول
منظم سامان نہیں ہے، اور بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے، کہ اب بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں
بے شمار معدنی دولت مدفون ہے، جس کا ذکر چودھوین صدی عیسوی میں ہندوؤں کی کیمیا میں
پایا جاتا ہے، لیکن آج یہ ہندوستان سے مفقود ہے، حالانکہ بہار، مدراس، اور پنجاب میں اس کی کانین
موجود ہین، مگر اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، پارہ ہندوستان میں اس وقت نہیں پایا جاتا ہے،
لیکن گذشتہ عہد کیمیا میں اس کا ذکر اکثر آتا ہے، ہندوستان میں اس کی کانیں دریافت ہوسکتی ہین اور

ازمنۂ قدیم و وسطی کے ہندوستان میں گندھک کثرت سے استعمال ہوتی تھی، مغلوں نے اپنے زمانہ میں اس سے ہر قسم کا کام لیا، مگر کبھی باہر سے منگوانے کی ضرورت نہیں پڑی، لیکن آج گندھک بہت ہی قلیل مقدار میں یہاں دستیاب ہوتی ہے، گذشتہ صدی کے وسط تک دنیا کے تمام ہیرے ہندوستان ہی کی پیداوار تھے، لیکن آج ہندوستان میں ہیرے کی کان کنی قابلِ توجہ نہیں، البتہ سونا کی طرف پوری توجہ دی جاتی ہے، ہندوستان کے بہت سے دریاؤں کے نام مثلاً بہار میں سونا پت، سوبرنا رکھا، آسام میں سوبرن سری، دھان سری، یوپی میں سونا، اور دہلی میں سونا وغیرہ ایسے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ ان کا تعلق سونا سے کچھ نہ کچھ ضرور رہا ہے،

آخر میں صدر موصوف نے کہا کہ اگر ارضیات کی تعلیم کا بہتر انتظام ہو، تو آج ہندوستان کی پوشیدہ معدنی دولت کے زیادہ سے زیادہ اضافہ ہونے کا امکان ہے،

شعبۂ زراعت کی صدارت ڈاکٹر جے ان، مکرجی نے کی، انھوں نے ہندوستان کی زراعتی زمین کو زرخیز بنانے پر زیادہ زور دیا، پھر اس کی تفصیل بتائی، کہ کس طرح ہندوستان کی زراعتی زمین محض بے توجہی، اور بے اعتنائی کے باعث اب تک اس لائق نہ ہو سکی ہے، کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھائے جاسکیں، آخر میں یہ کہا کہ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچانے کے لئے حکومت کی سرپرستی کی بھی ضرورت ہے، لیکن صدر موصوف نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا، کہ اب تک بنگال، آسام اور اڑیسہ میں زراعت کی تعلیم کے لئے کوئی کالج قائم نہیں کیا گیا،

شعبۂ جغرافیہ و علم پیمایش ارض میں پروفیسر سوبرامینم نے کہا کہ ہندوستان میں دنیا کے تمام کلچر اور تمدن آپس میں ملتے ہیں، جن کے اثر سے ایک خاص تمدن پیدا ہو رہا ہے، جس طرح انگلستان شمالی یورپ کے تمدن اور امریکہ پورے یورپ کے تمدن کی ترکیب امتزاجی کا نمونہ ہے، اسی طرح ہندوستان تمام دنیا کے تمدنوں کے امتزاج کا نمونہ ہوگا،

اس کانگریس میں ایک روز سر شاہ سلیمان کا بھی لکچر ہوا، جس میں انھوں نے اپنے جدید نظریۂ اضافیت کی تشریح کی، اور بجلی اور کشش ثقل میں اتحاد دکھایا،

یہودی اور سائنس

جرمنی کا مشہور سائنس دان جوہانس اسٹارک جس کو طبعیات کی تحقیقات میں ۱۹۱۹ء میں نوبل انعام مل چکا ہے، انگلستان کے مشہور رسالہ نیچر میں رقمطراز ہے، کہ یہودی مثلاً آئنسٹائن وغیرہ سائنس کی تحقیقات میں محض ادعا پسند اور نظریے قائم کرنے والے رہے ہیں جس سے ہر زمانہ میں سائنس پر بہت ہی برا اثر پڑا ہے، اس مضمون سے ممالک متحدہ امریکہ کے سائنس دان بہت برافروختہ ہوئے، اور انھوں نے فرانز بواس کے ماتحت ایک مجلس تشکیل کی، فرانز بواس نسلاً جرمن یہودی ہے، اور آج کل کولمبیا یونیورسٹی میں علم الانسانیات کا پروفیسر ہے، اور گذشتہ چوتھائی صدی سے جرمنوں کے نسلی نظریہ کی تردید شائع کر رہا ہے، جرمنی میں اس کی تمام کتابیں جلا دی گئی ہیں، اسی کی نگرانی میں امریکہ سے اسٹارک کا جواب شائع ہوا ہے، جس پر ۱۲۸۴ سائنس دانوں کے دستخط ہیں، اس جواب میں یہ دکھایا گیا ہے، کہ سائنس کی تحقیقات، مذہبی، قومی، نسلی اور ملکی پابندیوں سے بالکل پاک ہیں، اس کے بعد یہودیوں نے طبعیات، کیمیا، طب، اور علم الحیوانات میں جو تحقیقات کی ہیں، ان کو بتایا گیا ہے، اور آخر میں اس کی تردید کی گئی ہے، کہ نظریے قائم کرنے سے تجربی تحقیقات کو ضرر پہونچا ہے، کوپرنیکس سے کپلر کے زمانہ تک کوئی تحقیق ایسی نہیں ہے جس کے لئے پہلے نظریہ قائم نہ کر لیا گیا ہو

(ص ع)

ادبیات

خونِ جگر

از جناب جگر مرادابادی

اب تو نامِ عشق سے بھی سخت گھبراتا ہے دل — اے مرے اللہ! کیا سے کیا ہوا جاتا ہے دل

کیا بتاؤں دل سے مل کر کیا غضب ڈھاتا ہے دل — جسطرح آندھی کوئی آتی ہے یوں آتا ہے دل

سامنے ان کے ہمیں ہے اسکی ظالم شوخیاں دل — وہ نہیں ہوتے تو کیا نادان بن جاتا ہے دل

جب ستم ہی مُدعا ٹھیرا ستم بھی کیا ضرور — کچھ نہ کچھ تسکین سی یوں بھی تو پا جاتا ہے دل

دل تو سینے ہی میں رہتا ہے مگر اسکے حضور — جیسے اب جاتا ہے دل، سینے سے اب جاتا ہے دل

گاہے گاہے خود بہک جاتا غنیمت ہے مگر — بس خدا ہی اُس کا حافظ جسکو بہکاتا ہے دل

رہ گیا ہے اب تو بس اتنا ہی ربط اک شوخ سے — سامنا جس وقت ہو جاتا ہے بھر آتا ہے دل

دل کی عظمت اللہ اللہ لیکن اس کا کیا علاج — اپنی ہی موجوں میں ظالم خود بہا جاتا ہے دل

دل سے دل کا آہ ملنا بھی قیامت ہے مگر — اے معاذ اللہ جس دم دل سے ٹکراتا ہے دل

رحم بھی غصہ بھی کیا کیا آہ آتا ہے جگر،
خود پھنسا کر عشق میں جب مجھ کو سمجھاتا ہے دل

غزل

از

جناب زاہد حسین صاحب احساس مرادآبادی

عشق کی فطرت ہے "غم" مسرور کرتے جائیے — کم سے کم اتنا مجھے مجبور کرتے جائیے،

عرض ہے میری اگر منظور کرتے جائیے — درد بخشا، درد کو دستور کرتے جائیے،

دل کو داغِ عشق سے مسرور کرتے جائیے — یعنی روشن اک چراغِ طور کرتے جائیے،

حسن سے کچھ اکتسابِ نور کرتے جائیے، — زندگی کو نعرۂ منصور کرتے جائیے،

ان کا جو ارشاد ہو منظور کرتے جائیے — عشق کو مجبور ہی مجبور کرتے جائیے،

ہاں ان ہی نظروں سے پھر دیجیے فریب التفات — میری ہستی سے مجھے پھر دور کرتے جائیے،

عشق میں یوں ہی ملا کرتے ہیں اکثر اختیار — چاہیے جتنا مجھے مجبور کرتے جائیے،

بڑھتی جائیں گی اُسی نسبت سے دل کی قربتیں — خود کو مجھ سے چاہیے جتنا دور کرتے جائیے،

عشق میں راحت کی ساری تہمتیں جاتی رہیں — زیست کے الزام کو بھی دور کرتے جائیے،

ہو ہی جائیگی کبھی احساس تکمیلِ حیات
دل کو دردِ عشق سے معمور کرتے جائیے

دعوتِ فکر و نگاہ

از جناب سیماب اکبرآبادی

اب ہیں غلام آفریں مدرسہ و خانقاہ — حجتِ مشرق پہ ہے خندۂ مغرب گواہ

علم کے پردے میں بھی چھپ نہیں سکتا گناہ — درس تہی ہوگیا پردۂ درِ خانقاہ

تیری نگہ قیدی طرۂ و تاج و کلاہ
میری نظر شہپر اشہد ان لا الٰہ

لالہ و برگ و گیاہ، انجم و خورشید و ماہ
منزل مقصود تک سیکڑوں ہیں سنگ راہ

آہ وہ ظالم جمال، ہائے وہ کافر نگاہ!
میری بھی دنیا خراب دل کی بھی دنیا خراب

مجھ میں ہیں شعلے بھرے برق رخ دوست کے
پہلے مجھے دیکھ لے پھر مجھے کہہ روسیاہ

حسن میں اور عشق میں فرق اور اسدرجہ فرق!
انکی جھلک بھی ثواب میری نظر بھی گناہ

سرخوش ذوق خودی حسن سراپا نیاز
جھک نہیں سکتی جبیں، اٹھ نہیں سکتی نگاہ

حاصل فکر و نظر، ایک بھی جلوہ نہیں،
اب نہ رہا غالباً دل بھی تری جلوہ گاہ

عشق کے آنسو فقط عشق کی آنکھوں میں ہیں
اہل ہوس کو کہاں حوصلۂ اشک و آہ

میرے لئے وارثی دو ہی پناہیں تو ہیں
مغفرت بے حساب، معصیت بے پناہ

رباعیات امجد

از

حکیم الشعراء امجد حیدر آبادی

دن رات کا مشغلہ ہے رونا دھونا
عشاق کا کام کیا ہے رونا دھونا
اشکوں سے گنہ کے داغ دھلجاتے ہیں
کیا خوب محاورہ ہے رونا دھونا

تا جان دارم بجان جان نزدیکم
تا دل دارم بہ دلستان نزدیکم
نقش قدم خود نگر و یادم کن،
ہر جا باشم ہمیں نشان نزدیکم

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر

الفرقان مجدد الف ثانی نمبر مرتبہ:- مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ دفتر الفرقان بریلی،

بریلی کے مشہور مذہبی اور اصلاحی رسالہ "الفرقان" نے ہندوستان کے مجددین علماء وصلحا کے تجدیدی کارناموں کے حالات میں خاص نمبر نکالنے کا مفید سلسلہ شروع کیا ہے، چنانچہ اس سے پہلے وہ حضرت مولانا سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے حالات میں "شہید نمبر" نکال چکا ہے، یہ نمبر حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں نکلا ہے، اس میں حضرت مجدد صاحب کے سوانح، اور آپکے مجددانہ کارناموں پر اچھے اور مفید مضامین فراہم کئے گئے ہیں، ان میں مولانا سید محمد مہدی حسن شاہجہانپوری کا مضمون "تجدید دین اور حضرت شیخ احمد سرہندی" مولانا عبد الشکور صاحب کا مضمون "الخطبۃ الشوقیہ" مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی کا مضمون "الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ" اور مولانا منظور نعمانی مدیر رسالہ کا مضمون "حضرت امام ربانی کا جہاد تجدید" زیادہ مفید اور پر از معلومات ہیں، پہلے مضمون میں مجددیت کی حقیقت، اس کے شرائط اور اسکی تاریخ کی روشنی میں حضرت مجدد صاحب کے کارناموں کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے مضمون میں آپکے مکتوبات سے آپ کی تجدید دین کو دکھایا گیا ہے، تیسرے مضمون میں عہد اکبری کی بے دینی، الحاد اور استخفاف دین

کو دکھا کر مجدد صاحب کے جہاد تجدید کی عظمت کو نمایاں کیا گیا ہے، یہ مضمون اس اعتبار سے زیادہ مفید ہے، کہ جب تک عہد اکبری کی دینی ظلمت کا پورا علم نہ ہو، اس وقت حضرت مجدد صاحب کے نور تجدید کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا، چوتھے مضمون میں تجدید کے مختلف پہلوؤں کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ مکتوبات سے دکھایا گیا ہے، اس کے علاوہ اور متعدد چھوٹے چھوٹے مفید مضامین ہیں، منظومات میں مولانا عبد الرشید صاحب شہزاد پوری کی نظم بڑی پر کیف ہے،

اردو اقبال نمبر، مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، تقطیع بڑی، ضخامت ۴۴۱ صفحے، قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

انجمن ترقی اردو نے حکیم الامتہ شیخ محمد اقبال مرحوم کی یادگار میں اردو کا یہ خاص نمبر نکالا ہے مرحوم اپنی اور حیثیتوں کو چھوڑ کر تنہا اردو کے محسن کی حیثیت سے بھی اس کے مستحق تھے، مرزا غالب کی موت کے وہ اس لئے بھی ماتم گسار تھے کہ ع گیسوے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے، انھوں نے اردو کی تنگ دامن شاعری کو جس کی ساری کائنات چند فرسودہ مضامین تک محدود تھی، حقائق و معارف کا گنجینہ بنا دیا، اردو نے یہ نمبر نکال کر کلام اقبال کے ایک بڑے تقاضے کو پورا کر دیا اس میں اقبال کی تعلیمات اور ان کی خصوصیات شاعری کی پوری شرح موجود ہے، اس نمبر میں آٹھ مضامین ہیں، "اقبال کا تصور خودی" ڈاکٹر عابد حسین صاحب " رومی، نطشے اور اقبال" ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ "اقبال اور آرٹ"، ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب جامعہ عثمانیہ " اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام" ڈاکٹر قاضی عبد الحمید صاحب " اقبال کا ذہنی ارتقا" ابو ظفر عبد الواحد صاحب ایم اے لکچرار سٹی کالج حیدر آباد، " اقبال کا تصور زمان" سید شبیر الدین احمد صاحب "علامہ اقبال کی آخری علالت" سید نذیر نیازی صاحب " اقبال اور اس کے نکتہ چین" آل احمد صاحب سرور مسلم یونیورسٹی، ان میں چھٹے اور ساتویں مضامین کو چھوڑ کر باقی

چھ مضامین میں اقبال کی شاعری اور ان کی تعلیمات کے تمام اہم پہلوؤں پر نہایت جامع تبصرہ ہے، ہر مضمون میں اس کے متعلقہ مباحث پر نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، اب تک اقبال کی شاعری کے متعلق جس قدر لٹریچر اردو میں شائع ہو چکا ہے، اس میں سے کسی میں یکجائی طور پر اس نمبر کے برابر اقبال کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے، جس سے اس کے تمام پہلو آئینہ ہو جائیں، جن لوگوں کو اقبال کے کلام کے مطالعہ کا کم موقع ملا ہے، یا مناسبت نہ ہونے سے، ان کی تعلیمات کا پورا نقش ذہن میں نہیں جما، انھیں اس نمبر کا ضرور مطالعہ کرنا چاہئے سرور صاحب نے اقبال کے نکتہ چینیوں کا تشفی بخش جواب دیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک جو لوگ الفاظ کے طلسم میں الجھے ہوئے ہیں، اقبال کا کلام ان کے مطالعہ کی چیز ہی نہیں ہے، اور جنھیں ان کی تعلیمات پر اعتراض ہے، انھوں نے یا اس کا پورا مطالعہ نہیں کیا ہے یا اس کی روح سے نا آشنا ہیں، ایسے لوگ اور زیادہ لائق خطاب نہیں، اقبال اسلامی شاعر تھے، اور اسلام کی دی ہوئی تعلیم کی حد تک ساری دنیا کے لئے امن و آزادی کے پیامی تھے، اس سے زیادہ بلند بانگ دعوؤں کی حیثیت خوش آیند تخیل سے زیادہ نہیں ہے،

ترجمان القرآن، مرتبہ مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی، تقطیع بڑی ضخامت ۳۲۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ :- دار الاسلام پٹھان کوٹ پنجاب،

مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی نے موجودہ سیاسی کشمکش میں مسلمانوں کی پوزیشن اور ان کے آیندہ طریقہ کار کے متعلق جو مضامین لکھے تھے، ان کا یہ دوسرا حصہ ہے، اس میں بارہ مضامین یا بحثیں ہیں، ان مضامین میں انھوں نے اپنے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات، سیاسی تحریک کے رہنماؤں کے خیالات اور ان کے مطمح نظر پر تنقید اور موجودہ نظام حکومت کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ وہ مسلمانوں کی انفرادی حیثیت کے بقا اور ان کی قومی خصوصیات

کے تحفظ کے لئے سخت مہلک ہے، اس میں رہ کر ان کی قومی خصوصیات قائم نہیں رہ سکیں اور وہ دوسری قوموں کے ساتھ ضم ہو جائینگے، ان مضرتوں کو دکھانے کے بعد اپنے نقطۂ خیال سے ایسا نظامِ عمل پیش کیا ہے جو مسلمانوں کی قومی خصوصیات اور ان کی انفرادی بقا کا ضامن ہو سکے،

سب رس دکن نمبر، مرتبہ مجلس ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت: عمر، پتہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن،

اس نمبر میں قدیم عہد سے لیکر موجودہ دور تک کی دکن کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے، ابتدا میں اسلامی عہد سے پہلی کی مختصر تاریخ ہے، پھر اسلامی فتوحات کے دور کا حال ہے، اس کے بعد دکن کے اسلامی حکمران خانوادوں، بہمنی، عادلشاہی، قطب شاہی اور آصفی فرمانرواؤں کی سیاسی تاریخ اور ان کے امرا کے مختصر حالات ہیں، ضمناً کہیں کہیں علمی اور تمدنی حالات کے اشارہ بھی ہیں، اس سیاسی تاریخ کے علاوہ دکن کے قدیم آثار یہاں کے علمی، تمدنی، صنعتی اور معاشرتی حالات پر بھی بعض چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں، سلاطین، امرا اور آثار کے ۸۰ فوٹو دیتے ہین، اس نمبر کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے، کہ دکن کی تاریخ کا ایک مختصر مجموعہ مرتب ہو جائے، اس لئے اس کا کوئی مضمون مبسوط و محققانہ نہیں ہے، بلکہ ابتدائی درجوں کی درسی تاریخون کے طریقہ پر دکنی سلطنتوں اور حکمرانون کے مختصر حالات لکھدیئے گئے ہین،

سالنامۂ ادبی دنیا، مرتبہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی و صلاح الدین احمد صاحب تقطیع بڑی، تقریباً اخباری، ضخامت ۲۵۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہر، پتہ مال روڈ لاہور،

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ اس کے گذشتہ سالناموں کی طرح تمام ظاہری اور معنوی خصوصیات کا حامل ہے، علمی و ادبی مضامین، ستھرے افسانے اور منظومات ہر ذوق کا وافر سامان موجود ہے،

افسانے قریب قریب سب پر لطف اور پڑھنے کے لائق ہیں "نفرت" "من کی من میں" "روشنی کی کرن" "مسافر" "قبرستان کی ساحرہ" دلچسپ ہیں "ایک اتوار" "ایک شوہر کا روزنامچہ" "بدلا ہوا زمانہ" "اور کنول" خصوصیت کیساتھ پڑھنے کے لائق ہین، افسانوں کے مقابلہ میں علمی مضامین نسبتہً کم اور معمولی ہیں، تاہم ان میں بھی "ودیاپتی اور اس کے گیت" "جرمن نسل کا ایک اردو شاعر" اور "سورج کا زوال" مفید ہیں، پروفیسر برلاس کا مضمون "جاپانی لڑکیوں کا تخیل" بہت دلچسپ ہے،

سالنامہ عالمگیر، مرتبہ جناب حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی، ضخامت ۲۱۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ:- دفتر عالمگیر بازار سید مٹھا، لاہور،

عالمگیر کا سالنامہ اس مرتبہ کسی قدر پھیکا ہے، پھر بھی اس میں مطالعہ کے لئے دلچسپی کا کافی سامان موجود ہے اصلاحی افسانوں میں "بڑھاپے کی شادی" اور "کامیاب وکیل" سبق آموز ہیں، عام افسانوں میں "فراموش کار" "مادومی" "ڈاکٹر راشد" "خطرناک جادوگر" اور "جوانی کی یاد" دلچسپ ہیں، علمی مضامین میں "شاعر موت کے دروازہ پر" "درہ خیبر" اور "ابواسحٰق شیرازی" اور "ایجاد اولین" فائدہ سے خالی نہیں، مجموعی حیثیت سے یہ نمبر بھی خاصہ ہے،

سالنامہ ساقی، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب بی اے تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہر، پتہ دفتر ساقی دہلی،

ساقی کا یہ سالنامہ ادب و افسانے کا اچھا مجموعہ ہے، حسب معمول مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے شکسپیر کے ایک "ڈرامے" "بادشاہ لی ار" (King Lear) کا ترجمہ اور مختلف رنگ کے دلچسپ افسانے ہیں، "زندگی کی اندھیری راتین" "میں نے ایسا کیوں کیا" "ڈاک گھر" اور "بختاور" موثر اور سبق آموز اور "لال ہر" "وسادھو کی پتری" "رضیہ" "اور چند عاشقانہ خطوط" دلچسپ ہیں، "لال ہر" میں لونڈی کی بحث میں قلم کی شوخی اعتدال سے بڑھ گئی ہے،

ڈرامہ نگاری پر بھی بعض مضامین ہیں،

سالنامہ ہمایوں، مرتبہ میاں بشیر احمد صاحب بی اے آکسن تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ:- دفتر ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور،

اب غالباً ہمایوں حرف رسماً سالنامہ نکالتا ہے، چنانچہ اس کے عام نمبروں اور سالناموں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے، لیکن جو کچھ ہے وہ سنجیدہ اور مفید، فاضل مدیر کے قلم سے "یوم اردو" کا بیان اور ۳۸ء کے سیاسی حالات وانقلابات پر تبصرہ مفید مضامین ہیں، افسانوں میں "نقل واصل" بہت دلچسپ ہے، اور بھی چند افسانے اور ادبی مضامین ہیں،

سالنامہ پیام تعلیم، مرتبہ مولوی حسین حسان صاحب ندوی تقطیع اوسط ضخامت ڈیڑھ سو صفحے کاغذ معمولی، کتابت وطباعت اچھی، قیمت مرقوم نہیں، پتہ:- دفتر پیام تعلیم جامعہ ملیہ دہلی،

بچوں کے مفید اور مقبول رسالہ "پیام تعلیم" نے اس مرتبہ اپنا سالنامہ صنعت وحرفت پر نکالا ہے اس میں چھوٹی چھوٹی اور آسان صنعتوں پر مضامین ہیں، جنھیں بچے عملاً کر سکتے ہیں، مثلاً کاغذ کے پھول بنانا، ابری بنانا، گتے کا کام، اور باغبانی وغیرہ، بچیوں کے لئے سلائی اور کشیدہ کاری وغیرہ پر مضامین ہیں، ان صنعتوں کے نقشے اور عملی شکلیں بھی دیدی گئی ہیں، جنھیں دیکھ کر بچے آسانی کے ساتھ نقل کر سکتے ہیں، یہ مضامین بچوں کی صنعتی تربیت کے لئے بھی مفید ہیں اور دلچسپ مشغلہ بھی، صنعتی مضامین کے ساتھ بچوں کے ذوق اور دلچسپی کے لئے کہانیاں اور قصے بھی ہیں، لیکن ان سب میں صنعتی پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے، یہ سالنامہ گذشتہ سالناموں کے مقابلہ میں زیادہ مفید ہے،

الاصلاح عید نمبر، مرتبہ جناب علی جان صاحب سکین، تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت نہایت معمولی، قیمت مرقوم نہیں، پتہ ٹوڈگری اسمٰعیل پریس، بمبئی،

الاصلاح خوجہ جماعت کا ہفتہ وار اخبار ہے، عید الفطر کے موقع پر اس نے یہ نمبر نکالا ہے، مذہبی، علمی، اصلاحی، معاشرتی اور ادبی رنگارنگ مضامین کا ضخیم مجموعہ ہے، یہ ہفتہ وار سیاسی اور ادبی اخبار ہے، اس لئے تمام مضامین بھی اسی درجہ کے ہیں، کتابت کی غلطیوں کے علاوہ واقعات میں بھی کہیں کہیں غلطیاں نظر آتی ہیں، مثلاً ایک جگہ (ص ۶۷) اکبر کو لال قلعہ میں دکھایا گیا ہے، اور اس قبیل کی بعض غلطیاں ہیں، طباعت کی غلطیوں سے آیات قرآنی بہت غلط چھپ گئی ہیں، لیکن ہفتہ وار اخبار کا ایسا ضخیم کم دیکھنے میں آیا ہے، تصویریں بکثرت ہیں،

"م"

تابعینؒ

مرتبہ شاہ معین الدین احمد، ندوی

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے، اور صحابہ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانوں کے لئے نمونۂ عمل ہے، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہے، اس میں حضرت عمر بن عبد العزیزؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت اویس قرنیؒ، حضرت امام زین العابدینؒ، حضرت امام باقرؒ حضرت امام جعفر صادقؒ، حضرت محمد بن حنفیہؒ، حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت سعید بن جبیرؒ، حضرت محمد بن سیرینؒ، امام ابن شہاب زہریؒ، امام ربیعۃ الرائےؒ، امام مکحول شامیؒ، قاضی شریحؒ وغیرہ، چھیانوے اکابر تابعینؒ کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور عملی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے،

ضخامت:- ۵۶۰ صفحے، قیمت:- للعہ

"منیجر"

مطبوعاتِ جدیدہ

مسلمانوں کا ماضی حال اور مستقبل از میان بشیر احمد صاحب بیرسٹرایٹ لا، مدیر ہمایون تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۲؍ پتہ دفتر ہمایون نمبر ۲۳، لارنس روڈ لاہور،

میان بشیر احمد صاحب نے انجمن حمایت اسلام لاہور کی طلائی جوبلی کے موقع پر یہ تقریر کی تھی، جسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس میں مسلمانون کے روشن ماضی اور موجودہ انحطاط پر تبصرہ کرکے آیندہ ان کی اصلاح و ترقی کا پروگرام بتایا ہے، اس سلسلہ میں دنیا کی سیاسی رفتار اور موجودہ عالمگیر انقلابات یورپ کی محدود قومیت اور وطنیت اور زندگی کے تمام شعبوں میں ان کے مادی نقطۂ نظر اور اس کے نتائج کو دکھا کر اس کے مقابلہ میں اسلام کے روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر، اسکی وسیع اور ہمہ گیر قومیت، اس کے جمہوری نظام اور اخلاق و روحانیت اور عمل سے معمور دستورِ حیات کو پیش کیا ہے، اس کے بعد مسلمانون کی علمی اور تمدنی ترقیوں، اور اس سے یورپ کے استفادہ کے حالات اور مسلمانون کے زوال اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے، پھر ہندوستان میں مسلمانوں کی عادلانہ حکومت اور ان کی علم پروری اور تمدن نوازی کا مختصر ذکر کرکے انگریزی عہد میں ہندوستان کے سیاسی ارتقار اور مسلمانوں کے زوال و انتشار کی کہانی سنا کر اُن کی آیندہ تعمیر کے لئے مذہبی معاشرتی، معاشی، تعلیمی اور سیاسی اصلاح و تنظیم کے مشورہ دیئے ہیں، اور اس کے عملی طریقے بتائے ہیں، اس تقریر میں کوئی نئی بات نہیں ہے، بار بار کی کہی ہوئی باتیں ہیں، سیاسی خیالات میں آج کل کا اختلافی نقطۂ نظر نمایاں ہے، لیکن میان صاحب

نے جو کچھ کہا ہے، اسلامی درد سے کہا ہے، اور مذہب سیاست اور تمدن ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھا ہے، خدا ان باتون میں تاثیر عمل عطا فرمائے،

مکاتیبِ مہدی مرتبہ مہدی بیگم تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۲ صفحے، کاغذ سپید کتابت و طباعت روشن قیمت:- ع۱؍ پتہ مہدی بیگم بسنت پور گورکھپور،

مکاتیب مہدی ہماری زبان کے نامور انشار پرداز ایم مہدی حسن افادی الاقتصادی مرحوم کے خطوط کا مجموعہ ہے، مرحوم اردو زبان کے ان صاحب طرز انشار پردازوں میں تھے جن کا طرز انہی کے ساتھ ختم ہوگیا، مولوی محمد حسین آزاد کی طرح ان کا طرز نگارش بھی ناقابل تقلید تھا، وہ فطرۃً حسن دوست اور جمال پرست تھے، جس کا پرتو انکی زندگی کے ہر شعبہ میں نمایان تھا، اس اثر نے انکی انشار کو حسن و پاکیزگی، لطافت و نزاکت اور شوخی و بانکپن کا بوقلموں گلدستہ بنا دیا تھا، ان کی کوئی تحریر اس رنگ سے خالی نہ ہوتی تھی، یہی حال ان کے خطوط کا ہے، ان کی شوخی تحریر کبھی کبھی ایسے نازک حد کو پہنچ جاتی ہے، جسکا سنبھالنا انہی جیسے ادا شناس ادب کا کام تھا، وہ اپنے حسن مذاق سے اس پر ایسا لطیف حجاب ڈالدیتے تھے، کہ کہنے کو پردہ بھی حائل ہوجاتا ہے، اور اندر سے شوخی بھی مسکراتی رہتی ہے، انکی تحریر کی لطافتیں نقد و تبصرہ کی متحمل نہیں ہیں، استاذِ محترم مولینا سید سلیمان ندوی نے دیباچہ میں بالکل صحیح تحریر فرمایا، ہو کہ مرحوم کے خطوط پر نقد و تبصرہ اور انکی خوبیوں کو ایک ایک کرکے دکھانا ایسا ہی ہے، جیسے کسی خوشرنگ اور خوشبو پھول کی ایک ایک پنکھڑی کو توڑ کر کوئی ستمگار قدرت کی صناعی کی داد دے، وہ پھول ہیں پھول، انکی قدر یہی ہے کہ آپ ان سے لطف اُٹھائیں اور بس جہان آپنے ان کی طرف ہاتھ بڑھائے وہ مرجھانے لگے اور نازک پتیان آپکی انگلیوں کی سختی سے جھڑنے لگیں"، ان کے ادب و انشار کے ادب شناسوں کو اس شاعرانہ حقیقت کا پورا اندازہ ہوگا، عام طور پر پبلک کی نگاہوں کے سامنے آنے والے مضامین اور نجی کے خطوط میں بڑا فرق ہوتا ہے، مضامین میں تحسین و قبول کرنے کچھ ادب و انشار کا اہتمام ہوتا ہے، کچھ ناقابل اظہار

جذبات وخیالات کا اظہار ہوتا ہے، اسلئے کسی شخص کے صحیح خیالات، اندرونی جذبات اور بے ساختہ
طرز تحریر کا صحیح اندازہ اس کے نجی خطوط ہی سے ہوسکتا ہے، اس میں تکلف و تصنع کا کوئی پردہ نہیں
رہتا، اور لکھنے والے کی شخصیت بے حجاب نظر آتی ہے، اس لحاظ سے مرحوم کے مضامین کی انشاء کی خصوصیات
اور ان کے خطوط میں کوئی فرق نہیں، جو شوخی و سحر طرازی سر مخمل تھی، وہی پردہ محمل میں نظر آتی ہے، ان
میں مختلف لوگوں کے نام کم وبیش ۲۰۰ سو خطوط ہیں اور مکتوب الیہم کے تعلقات، شخصیت اور مذاق کے لحاظ سے ان
کے مضامین مختلف ہیں، کسی میں علمی مشورے ہیں، کسی میں ادبی لطائف ہیں، کسی میں شوخی و ظرافت ہے، کسی
میں خانگی باتیں ہیں، غرض یہ مجموعہ رنگارنگ پھولوں کا گلدستہ ہے، لیکن ادب و انشاء کی نیرنگیاں سب
میں یکساں ہیں، ان خوبیوں کیساتھ مرحوم انسان تھے، ان کا دور دوسرا تھا، مذاق جدا گانہ تھا، اس لئے
آج کل کے مذاق کے لحاظ سے بعض خیالات اور اسلوب اجنبی معلوم ہوں گے، جو زمانہ اور مذاق کے
تغیر کا لازمی نتیجہ ہے،

تنویر ادب مؤلفہ جناب احمد جان صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۹۵ صفحے، کاغذ
کتابت وطباعت بہتر قیمت اور پتہ مرقوم نہیں غالباً روپیہ سوا روپیہ میں الہ آباد کے تاجران کتب
کتب سے ملے گی،

اردو نظم ونثر کی علیحدہ علیحدہ مطول تاریخیں متعدد ہیں، لیکن دونوں کی مشترک بہت کم ہیں
پھر ان میں جدید تحقیقاتوں کا پورا استقصار نہیں ہے، اور ایسی مختصر اور جامع تاریخیں تو بالکل نہ تھیں
جو اردو کے طلبہ کو طویل کتابوں کے مطالعہ کی زحمت سے بچا سکیں، اس طرف اس طرز کی ایک دو کتابیں
لکھی گئیں، لیکن وہ بعض پہلوؤں سے ناقص ہیں، "تنویر ادب" ہر لحاظ سے مکمل اور جامع ہے، اب تک اردو
نظم ونثر کے متعلق جو کچھ لکھا جا چکا ہے، اور جتنی تحقیقات ہو چکی ہے، وہ سب بہن سلیقہ کے ساتھ جمع
کردی گئی ہے، ابتدا میں اردو زبان کے ماخذ اور اسکے تکوینی دور کے مختصر حالات اور اسکے ابتدائی نمونے

ہیں، پھر شاعری کے ابتدائی دور یعنی دکنی شاعری کی تاریخ ہے، پھر شمالی ہند میں اس کے آغاز سے
لیکر موجودہ عہد تک کے تمام دوروں کے حالات، شاعری کی عہد بعہد کی ترقیوں، ان کی خصوصیات
اور تغیرات پر تبصرہ ہے، اسی طرز پر نثر کی پوری تاریخ ہے، اس طرح اس میں اردو نظم
ونثر کی تاریخ، شعراء، ادیبوں اور مصنفوں کے حالات، ہر دور کی ادبی خصوصیات، رجحانات،
تغیرات، مصنف کے خدمات، اسلوب تحریر، وغیرہ زبان وادب کے مختلف پہلوؤں پر ناقدانہ تبصرہ
ہے، اس کتاب میں معلومات کے لحاظ سے کوئی نیا اضافہ نہیں ہے، لیکن اختصار اور جامعیت کیساتھ
ترتیب اور تنقید بہت اچھی ہے، خصوصاً اردو نثر کے اصناف کی تقسیم اور تنقید میں حسن مذاق سے کام
لیا گیا ہے، یہ کتاب اردو کے طلبہ کیلئے بہت مفید ہے،

حیدرآباد دکن میں آریا سماجی تحریک شائع کردہ محکمہ اطلاعات ریاست حیدرآباد، تقطیع بڑی ضخامت
۹۵ صفحے، پتہ محکمہ اطلاعات حیدرآباد

آریوں نے جن غلط اور بے بنیاد الزاموں کو آڑ بنا کر ریاست حیدرآباد کے خلاف شورش مچا رکھی
ہے، اس سرکاری بیان میں اسکی تردید اور آریوں کی فتنہ انگیزیوں کی پوری تفصیل ہے، آریہ لیڈروں
کی اشتعال انگیز تقریروں اور ان کے اخبارات کے مضامین کے اقتباسات مع حوالہ نقل کئے گئے
ہیں، ریاست پر جو غلط الزامات لگائے جاتے ہیں، اور واقعات کو جس طرح مسخ صورت میں پیش کیا
جارہا ہے، اور ہندو ومسلمانوں کی مشترکہ پابندیوں کی جو یک رُخی تصویر دکھائی جارہی ہے، ان سب
کی حقیقت ظاہر کی گئی ہے، اس بیان کو پڑھنے کے بعد کوئی منصف مزاج ہندو بھی آریوں کی شورش
کو حق بجانب قرار نہیں دے سکتا، یہ واقعہ ہے کہ رعایا کی آزادی، اور غیر مذاہب والوں کیساتھ
رواداری میں ریاست حیدرآباد اکثر دیسی ریاستوں میں ممتاز ہے، اسکی تفصیلات میں پڑنے کا یہ
موقع نہیں ہے، لیکن واقف کار ہندو بھی اس سے انکار نہیں کرسکتے، کہ آج حیدرآباد میں کتنی ہندو

ریاستیں ہیں، کتنے ہندو وظیفہ خوار ہیں، ان کے کتنے اداروں کو امداد ملتی ہے، ان کے معبدوں پر جاگیریں وقف ہیں، بحیثیت مجموعی ملازمتوں میں ان کا تناسب مسلمانوں سے کتنا زیادہ ہے، پھر یہ بھی قابلِ غور ہے، کہ مسلمان ریاستوں کے مقابلہ میں ہندو ریاستوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے، اس لئے آج جو آگ حیدرآباد کے خلاف لگائی جارہی ہے، کیا کل اس کے شعلے ہندو ریاستوں میں نہ پہنچ جائیں گے، جائز حقوق کے لئے جد وجہد کرنا بُرا نہیں ہے لیکن اس کو فرقہ وارانہ رنگ دیکر نفرت کی آگ بھڑکانا کسی حیثیت سے مفید نہیں ہے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ حیدرآباد میں مزید اصلاحات کا مسئلہ درپیش ہے، جو ہندو اخبارات آزادی کے مدعی ہیں، انھیں چاہئے، کہ اس پمفلٹ کو شائع کریں، یا کم از کم اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کریں،

بالشتیوں کی دنیا مترجمہ جناب سید فخرالدین صاحب، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲؍، دفتر روزانہ ہند، نمبر ۱۸- ساگر دت لین کلکتہ،

یہ کتاب انگریزی زبان کے مشہور مصنف جوناتھن سیوفٹ (Jonathan Swift) کی نہایت مقبول اور معروف کتاب ہے، مصنف نے اس میں ایک سیاح کے لباس میں بالشتیوں کی ایسی خیالی دنیا کے حالات دکھائے ہیں، جن کے قد کل چھ انچ کے ہیں، اسی تناسب سے یہاں کی ساری مخلوق نباتات، حیوانات، جمادات، پہاڑ، دریا، حکومت، فوج، مکانات، زندگی کے جملہ ساز و سامان چھوٹے چھوٹے ہیں، سید فخرالدین صاحب نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے، ترجمہ سلیس اور کتاب اتنی دلچسپ ہے، کہ بغیر ختم کئے ہوئے ہاتھ سے نہیں چھوٹتی،

"م"

جلد ۴۳ | ماہ محرم الحرام ۱۳۵۸ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۹ء | عدد ۳

مضامین